چراغ حسن حسرت

کی غیر مدوّن تحریروں کی تدوین اور جائزہ

(شاعری)

مقالہ برائے ایم فل (اُردو)

۱۹۸۹-۹۰ء

مقالہ نگار
طیّب منیر

نگران
ڈاکٹر سلطانہ بخش

ایم۔فل ڈگری کی جزوی تکمیل کے لئے

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

چراغ حسن حسرت

۱۹۰۴ء - ۱۹۵۵ء

اظہارِ تشکر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے فاصلاتی تعلیم و تحقیق کے سلسلے میں قابلِ تحسین اور مؤثر کردار ادا کیا ہے ۔ ۱۹۸۷ء میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے میدان میں ایم ۔فل اُردو کے پروگرام کا اجراء بھی کیا گیا ۔ راقم کو ایم ۔فل ڈگری کی جزوی تکمیل کے لئے چراغ حسن حسرت کی غیر مدوّن تحریروں کی تدوین اور جائزے کا کام تفویض کیا گیا ۔ مقالے کی ترتیب و تدوین کے دوران بہت سے دوست، احباب نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے اپنی قیمتی آراء سے نوازا ۔ یہ میرا خوش گوار فریضہ ہے کہ میں اُن کا شکریہ ادا کروں ۔

مقالہ ہذا کے نگران ڈاکٹر سلطانہ بخش صاحبہ کا میں بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی علمی و ادبی مصروفیات کے باوجود ہر موقع پر میری راہنمائی فرمائی ۔ مجھے جہاں بھی کسی الجھن یا اشکال کا سامنا ہوا اُن کے مشورے مشعلِ راہ ثابت ہوئے ۔

محترم سیّد ضمیر جعفری صاحب نے نہایت لطف و مہربانی سے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر میرے استفسارات کے جواب مرحمت فرمائے ۔ آپ نے چراغ حسن حسرت کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کیں جن کا حصول کسی اور ذریعے سے ناممکن تھا ۔

مکرمی کرنل مسعود احمد صاحب کا میں خاص طور پر ممنونِ احسان ہوں جنھوں نے حسرت کے دیرینہ ساتھی ہونے کے ناطے میرے کام میں دلچسپی ظاہر کی اور اپنے کاغذات کے انبار میں سے حسرت کی دو ایک نادر نظمیں اور چند متفرق تحریریں تلاش کر کے عنایت فرمائیں ۔

اپنے پیارے دوست محمد ارشد کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے کراچی میں ہوتے ہوئے میری مختلف علمی و ادبی فرمائشوں کا خیال رکھا ۔ اگرچہ مجھے اُن کو بتانے میں ایک عرصہ لگ گیا کہ سند باد جہازی چراغ حسن حسرت کا قلمی نام تھا ۔

برادرم محمد رمضان صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر آرکائیوز کا بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے اخبارات اور چند نادر رسائل تک میری رسائی ممکن بنائی ۔

باقی سب احباب کا بھی سپاس گزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کی ترتیب کے دوران کسی بھی صورت میں میری اعانت فرمائی ۔

اِبتدائیہ

چراغ حسن حسرت نے ادب کی اکثر و بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی۔ بے عیب نثر لکھنے میں اُن کے معاصرین اور متاخرین میں اُن کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا۔ طنزیات و مضحکات کے میدان میں انہوں نے ایک ایسا اسلوب متعارف کرایا جو اوروں کے لئے مشعلِ راہ اور قابلِ تقلید ثابت ہوا۔ تنقیدات، تبصرہ نگاری، مضمون نگاری، ڈرامہ نویسی، تاریخ نویسی ترجمہ نگاری، کالم نویسی، انشاپردازی جیسے مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھایا اور یادگار تحریریں چھوڑیں۔

حسرت کے اسلوبِ نگارش اور طرزِ تحریر کی گیرائی سے انکار ممکن نہیں۔ اُن کی ہر نوع کی تحریروں میں دل نشینی اور دلاویزی کے پہلو نمایاں ہیں۔ اُن کے اسلوب میں سادگی اور سلاست بنیادی چیزیں ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی تحریریں ناگواری اور پھکڑ سے بالکل پاک ہیں۔ موضوع پر گرفت میں وہ بے مثل تھے۔ ابنِ انشاء نے لکھا ہے کہ:

"اُن لوگوں میں جن کی مادری زبان اردو نہیں حسرت سے بڑا ادیب پیدا نہیں ہوا۔"

حسرت کی نثری فتوحات اور اُن کی اہمیت کے پیشِ نظر نقادانِ ادب نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ لیکن حسرت کی شعری تخلیقات پر بہت کم لکھا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اُن کی شعری کاوشیں کم تھیں اور جو تھیں وہ منتشر صورت میں پرانے اخبارات و رسائل میں دب کر رہ گئیں۔ وہ اخبار جن میں حسرت شروع شروع میں لکھتے رہے۔ جیسے 'احسان'، 'شہباز' وغیرہ اُن کی فائیلیں دستبردِ زمانہ کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ کلکتہ، سنگاپور کے قیام کے دوران میں جو کچھ انہوں نے لکھا وہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

حسرت کی غیر مدوّن شعری تخلیقات کی ترتیب و تدوین کا بڑا محرک یہی ہے کہ اس ہمہ جہت شخصیت کی زندگی کے اس اہم ترین گوشے کو سامنے لایا جائے۔ اُن کی شاعرانہ حیثیت کے بارے میں اُن کے معاصر ثقہ حضرات کی رائے یہ تھی کہ:

"حسرت کا شاعرانہ کلام مقدار کے اعتبار سے کم لیکن نفاست کے لحاظ سے بعض معاصرین کے پورے مجموعوں پر بھاری ہے"۔ (عبدالمجید سالک، مضامینِ حسرت)

چراغ حسن حسرت کے کلام کی کم مقداری بھی اس انتظار میں تھی کہ اُسے ترتیب وتدوین
کے مرحلے سے گزارا جائے ۔ پانچ چھ غزلوں، اور دو چار نظموں کے سوا اُن کا کلام مرتب
صورت میں نہیں تھا، اس لئے یہ ضروری تھا کہ حسرت کی شاعری کو مرتب ومدون کیا جائے
تاکہ نادر ونایاب اور کمیاب چیزیں محفوظ ہو جائیں نیز شاعری میں اُن کا مقام بھی متعین ہو جائے ۔

بڑی محنت اور کوشش وکاوش سے اس مقالے میں حسرت کی جو شعری تخلیقات پردۂ اخفاء
میں تھیں اُن کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے ۔ غزلوں کی ترتیب وتدوین کے علاوہ نظموں کی ایک بڑی تعداد
کے پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ منتشر کلام کے مواد کو اکٹھا کرنے میں پرانے اخبارات و رسائل
کا کھوج لگایا گیا اور شعری تخلیقات کے ماخذ کی تلاش میں ہر ممکن ذرائع استعمال کئے گئے ہیں ۔

حسرت نے شاعری میں اپنے معاصرین اور متاخرین شعراء کو متاثر بھی کیا ۔ اگر حسرت کا تمام
شعری سرمایہ سامنے آجائے تو یہ اردو شاعری کے ایک مخصوص دور کو سمجھنے میں معاون ہوگا ۔
یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اردو شاعری کی تاریخ لکھے اور حسرت کو نظر انداز کر جائے ۔ سید عابد علی عابد
نے لکھا ہے کہ: "موجودہ نسل کا شاید ہی کوئی بد نصیب ایسا ہو جس نے اُن سے کسی نہ کسی
مرحلے پر فائدہ نہ اٹھایا ہو"۔

حسرت ادب کی دنیا میں بڑی قدآور شخصیت کے حامل تھے وہ نہ صرف خود شاعر تھے بلکہ شاعر گر بھی
تھے ۔ اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اُن کے گمشدہ کلام کو تلاش کیا جائے ۔ متن درست کیا جائے ۔
مختلف اشاعتوں سے موازنہ کیا جائے ، جہاں ضرورت ہو حواشی لکھے جائیں ۔ اس طرح ایک اہم اور قیمتی ادبی سرمائے
کو تحقیق وتجزیے کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ اردو ادب کی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی
دریافت ہے لیکن یہ حرفِ آخر نہیں ہے مزید تحقیق کے دروازے کھلے ہیں ۔

طیب منیر

فہرست مضامین

باب اول

چراغ حسن حسرت — احوال و آثار

چراغ حسن حسرت ـــــ احوال و آثار

چراغ حسن حسرت ۱۹۰۴ء* میں بارہ مولہ (کشمیر) کے ایک گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے۔ حسرت کے
آباؤ اجداد ہندو تھے۔ حسرت رقمطراز ہیں "وہ ہمارے خاندان کی ایک شاخ یہاں (کھوئی رٹہ) آباد ہو گئی تھی۔
میرے کئی چچیرے بھائی اور رشتے کے اور کئی عزیز یہاں رہتے ہیں اور سب کے سب ہندو ہیں[1]"
عربی اور فارسی کی ابتدائی کتب کے مطالعہ سے حسرت کے والد پر اسلام کی حقانیت کا دروازہ کھلا۔
پہلے کشمیری پنڈت تھے۔ سچائی کی تلاش نے مہمیز دی تو اپنے ایک مسلمان ملازم رمضان کے ساتھ سوات پہنچے
اور حضرت اخوند کے مدرسے سے بدرالدین بدر بن کر نکلے۔ کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں کے قانون کے مطابق
حسرت کے والد صاحب اپنی آبائی جائیداد سے محروم کر دیئے گئے۔ اسی لئے جب آزاد خیال نوجوان
اسلام کو اپنی آزاد خیالی کی زد میں لا کر ژاژ خائی پر اتر آتے تو فرمایا کرتے "وہ بھائی آپ لوگوں کا
اسلام بہت پرانا ہے۔ آپ نسلاً بعد نسل مسلمان چلے آتے ہیں۔ اور وہ بھی رسماً۔ میرا اسلام دولت کا
ہے۔ میرے باپ نے اسلام قبول کیا تھا۔ میں نے اسلام کی قیمت ادا کی ہے۔ مجھ سے پوچھئے کہ اسلام کیا ہے[2]"

حسن علی حسن جو حسرت کے نانا تھے۔ انہوں نے حسرت کو بچپن ہی گود لے لیا تھا۔ فارسی اور
عربی کی تعلیم انہی سے حاصل کی°۔ بدرالدین بدر اور حسن علی حسن دونوں شاعر تھے اُن کا غیر مطبوعہ کلام
۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں حسرت کی بیش قیمت کتب کے ساتھ حوادث کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ذوقِ شعر و ادب
ننھیال سے پیدا ہوا۔ حسن علی حسن چونکہ خود بہت اچھے شاعر تھے اس لئے حسرت کی طبیعت و شخصیت
پر اُن کے اثرات سب سے زیادہ مرتب ہوئے۔

حسرت پہلی جماعت سے ہی شعر لکھا کرتے تھے[3]۔ اگر گاؤں کے پوسٹ ماسٹر کے بارے
میں ایک شعر اس طرح لکھا:

---

* بعض درسی کتب میں تاریخ پیدائش کا اندراج ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۵ء ہے جو کہ غلط ہے۔ 'چراغ حسن' تاریخی نام ہے
جس کے عدد ۱۳۲۲ھ ہوتے ہیں اس کے مطابق عیسوی سن ۱۹۰۴ء ہوتا ہے۔

° اس وقت ریاست میں ذریعہ تعلیم فارسی تھا حسرت نے باپ اور نانا سے گلستان بوستان پڑھی، سکندر نامہ اور یوسف زلیخا پڑھی۔
انگریزی کی تعلیم کے لئے مدرسہ میں داخل ہوئے۔

؎ شہر میں بال تین کہتے ہیں   ان کو مہتاب دین کہتے ہیں

تو اپنے ایک دوست کی بیوی سے لڑائی پر یہ اشعار لکھے:

ہیں میرے دوست ایک ملّا رسول   زشت رو، زشت خو، نامعقول

ان کے گھر کا سناتا ہوں احوال   روز بٹتی ہے جوتیوں میں دال

روز جورو سے مار کھاتے ہیں   مار کھاتے ہیں گیت گاتے ہیں ؎

چراغ حسن حسرت نے منشی فاضل پونچھ سے کیا اور پھر راولپنڈی سے انگریزی کا اضافی پرچہ پاس کر کے میٹرک کی سند حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء تک کشمیر میں مختلف مقامات پر تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ پیر حسام الدین سیکرٹری انجمن اسلامیہ پونچھ کی سفارش پر اُن کو اسلامیہ انگریزی مڈل اسکول میں اورینٹل ٹیچر کی ملازمت بھی ملی۔ تدریس کے ابتدائی ایام میں پڑھانے کے عوض جو اناج ملتا تھا وہ بوری میں ڈال کر کاندھے پر رکھتے اور کوٹ سے پہاڑ سے اُتر کر منڈی میں اُتر جاتے۔ یہ ذریعۂ معاش بھی تھا اور مستقبل کی مشکلات کی تیاری کے ساتھ درس خودداری بھی جو آخری دم تک اُن کا اثاثہ رہا*۔

مطالعۂ کتب کی عادت بچپن سے تھی۔ اس طرح علمی و ادبی معلومات کا ذخیرہ وافر اُن کے دل و دماغ میں جمع ہونے لگا۔ ۱۹۲۰ء میں سولہ سال کی عمر میں شملہ جا کر بشپ کاٹن اسکول میں فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں لاہور آ کر بی۔ اے کے امتحان کی تیاری مکمل کی مگر اسباب و حالات کی ناساعدت کے باعث امتحان نہ دے سکے*۔

حسرت کو موزونیٔ طبع قدرت کی طرف سے ملی تھی اور کچھ اپنے ابتدائی ماحول اور شوق نے اُن کے اندر علمی و ادبی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ بقول شورش کاشمیری،

وہ کسی زمانے میں انہوں نے قدماء کے ادب کو اپنے حافظے میں اتار لیا تھا۔

---

* روایت ظہیر الحسن جاوید، چراغ حسن حسرت کے بڑے بیٹے۔

* نقوش، طنز و مزاح نمبر میں صفحہ ۸۱۲ پر درج ہے کہ حسرت نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ جو درست نہیں۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نیرنگ خیال (سالنامہ) ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۲ پر لکھتے ہیں کہ "حسرت نے بی۔ اے کی تیاری پوری کی تھی لیکن امتحان نہ دے سکے"۔ یہ رائے قابل قبول ہے۔

اس طرح پڑھا جس طرح صحاح ستہ کے طلبہ حدیث پڑھتے ہیں۔ 'فسانۂ آزاد'
اور 'طلسم ہوشربا' تمام جلدیں بچوں کی طرح پڑھیں اور اُن کے الفاظ و معانی اور
محاورہ و روزمرہ پر قادر ہو گئے۔"[5]

اسلامیہ کالج کے ایک طالب علم دلبر حسن مسعود جو کہ حسرت کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، اُن کا
بیان ہے کہ :

"حسرت ہر لحظہ مطالعہ میں جٹے رہتے ہیں۔ اُن دنوں فسانۂ آزاد دوبارہ اُن کے زیر مطالعہ تھا
وہ نئے نئے الفاظ اور نئے نئے محاوروں پر سُرخ پنسل سے نشان لگاتے۔ لُغت سے رجوع کرتے
اور نوٹ بک میں درج کر لیتے۔ برسوں کا یہی شعار رہا۔ تمام ادب چھان مارا شاعری
اور ادب دونوں کے نباض ہو گئے"[6]

حسرت نے تدریسی زندگی کے دوران مختلف ادبی رسائل میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اخبارات و رسائل
سے تعلق کے باعث اُن کا رجحان ادب کے ساتھ صحافت کی طرف بھی مڑ گیا۔ جو بعد میں اُن کی فطرت
بن گیا۔ ۱۹۲۵ء میں حسرت کلکتہ چلے گئے جہاں باقاعدہ اُن کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ نائب مدیر
کی حیثیت سے 'عصر جدید' کے ادارے میں شامل ہو گئے اور پھر مدیر بن گئے ۱۹۲۵ء کے اواخر* میں نرنجن لال بابو
کے تعاون سے کلکتہ سے رسالہ 'آفتاب' نکالا۔ یہ رسالہ بڑی آب و تاب سے نکلا، جس طرح پنجاب میں
ہمایوں، 'مخزن'، 'ادبی دنیا'، 'نیرنگِ خیال' وغیرہ کا چرچا تھا اُسی طرح 'آفتاب' کا مغربی بنگال اور ہندوستان
کے دوسرے علاقوں میں بول بالا تھا۔ پہلے شمارے کے سارے مضامین حسرت نے خود لکھے۔ مالی پریشانیوں
نے جلد ہی اس آفتاب کو غروب کر دیا۔

فکاہیات کو پہلے پہل انہوں نے 'نئی دنیا' کلکتہ میں 'کولمبس' کے نام سے 'افکار و حوادث'
اور 'عصرِ جدید' کلکتہ میں 'کوچہ گرد' کے نام سے 'کلکتے کی باتیں' لکھنا شروع کیں۔ انہی کالموں کی بدولت
حسرت کا نام لاہور کے ادبی و صحافتی حلقوں میں لیا جانے لگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جب 'پیغام' جاری کیا

---

* 'مردم دیدہ' میں حسرت نے ۱۹۲۵ کا اخیر لکھا ہے۔ حالانکہ 'آفتاب' جنوری ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ حسرت سے تسامح ہوا ہے۔

تو حسرت اُس کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ حسرت کا تعلق پیغام سے اگرچہ زیادہ دیر تک نہ رہا،
لیکن مولانا آزاد کی شخصیت اور تبحرِ علمی نے اُن کو بہت متاثر کیا۔

حسرت، اقبال، آزاد، ظفر علی خاں، اور نصیر حسین خیال کے علاوہ کسی کو بڑا ادیب نہ جانتے تھے۔ ادب و شعر کی عام گفتگو میں حسرت اپنے سوا کسی کو کم ہی ملتے تھے۔ یہ انا اس لئے پیدا ہو گئی تھی کہ اُن میں ادب کا ذوق معراج پر تھا۔ شورش کاشمیری رقمطراز ہیں:

"اس باب میں شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اُن کا حریف ہو۔ وہ الفاظ کی نسلوں تک سے آشنا تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ فلاں محاورہ کہاں سے آیا؟ فلاں روزمرہ کی اصلیت کیا ہے؟ اس ضرب المثل کی بنیاد کس نے رکھی؟ یہ کہاوت کیوں کر بنی؟ فلاں ادیب کا سرمایۂ الفاظ کتنا ہے؟ فلاں شاعر کے ہاں کل کتنے الفاظ ہیں۔ عروض میں یگانہ اساتذہ میں منفرد"

اس صورت اور پس منظر میں یہ لازمی امر ہے کہ انا کا جذبہ بہت قوی صورت میں ظاہر ہو۔ بقول سید ضمیر جعفری "ایک عظیم نابغہ کی حیثیت سے اُن کی اپنی انا کا جذبہ بڑا قوی تھا۔"

۱۹۲۹ء میں جب مولانا ظفر علی خاں کلکتہ تشریف لے گئے تو حسرت کو لاہور لے آئے۔ یہاں حسرت 'زمیندار' کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ اکثر نام کے بغیر اور کبھی حسرت کاشمیری کے نام سے 'فکاہات' لکھنے لگے۔

لاہور کے زمانۂ قیام یعنی ۱۹۲۳ء میں ان کی شعری طنز یہ و مزاحیہ کارشوں کی جھلک اُس نظم میں ملتی ہے جو انہوں نے اسلامیہ کالج کے مجلہ 'کریسنٹ' کے مدیر اور مدیر اعلیٰ کے بارے میں لکھی تھی۔ مدیر اعلیٰ مرزا مقبول بیگ بدخشانی کے بارے میں لکھا:

اُردو پہ کرم فرما　　پشتو میں کیا کر تو
بلمنڈ کی موجوں میں　　جا اور بہا کر تو
اے قرقرِ قرتانی　　مرزائے بدخشانی

اور مدیر محمود نظامی کے بارے میں یہ اشعار رقم کیئے۔

محمود نظامی کے　　اشعار میں خامی ہے

گو زعم میں اپنے وہ فردوسی و جامی ہے

ہر چند کہ شاعر ہے شاگردِ گرامی ہے

سیکھو اس سے غزل خوانی مرزائے بدخشانی ۹

قیامِ کلکتہ کے دوران حسرت اپنے کالموں کی بدولت مشہور تو ہو ہی چکے تھے۔ لاہور آ کر زمیندار میں کام کرنے کی بدولت اُن کے ادبی قد و قامت میں مزید اضافہ ہوا۔ زمیندار کے علاوہ 'احسان'، 'احرار'، اور 'شہباز' وغیرہ سے بھی تعلق رکھا۔

۱۹۳۵ء میں حسرت نے روزنامہ 'احسان'* میں مطائبات کا کالم 'سندباد جہازی' کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ 'احسان' کی پیشانی کا شعر یہ تھا:

؎ راہ میں اُس محسنِ مطلق کی سر قربان کر - اُس کے بندوں سے جہاں تک ہو سکے احسان کر

'احسان' کے مالک نور الٰہی سے اختلاف کی بنا پر مرتضیٰ احمد میکش اور چراغ حسن حسرت اخبار سے علیحدہ ہو گئے اور نیا روزنامہ 'شہباز'° جاری کیا۔ یہ اخبار 'یونینسٹ' پارٹی کا ترجمان تھا۔ اس سے قبل حسرت چند دوستوں کے ساتھ مل کر 'انصاف' نام کا اخبار نکال چکے تھے، لیکن اس زمانے میں اخبار نکالنا پیسے کا کھیل تھا، اس لئے بند ہو گیا۔ اخبار کی پیشانی کے لئے حسرت نے یہ شعر تجویز کیا تھا:

؎ عالم سے مکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے - اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

---

* 'احسان' ۱۹۳۴ء میں لاہور سے نکلا۔ 'احسان' کے ایڈیٹر مرتضیٰ احمد میکش تھے۔ یہ اخبار مسلمانوں کے اخبارات میں پہلا تھا جس نے ٹیلی پرنٹر سروس حاصل کی۔ اس کا افتتاح قائدِ اعظمؒ نے کیا تھا۔ 'احسان' کے مالک ملک نور الٰہی تھے جو مسلم لیگ کے حامی تھے۔

° اخبار 'احسان' سے اختلافات کی بنا پر چراغ حسن حسرت عملۂ ادارت سمیت علیحدہ ہو گئے تھے اور نیا روزنامہ 'شہباز' جاری کیا۔ جسے کچھ عرصے کے بعد سید احمد علی نے خرید لیا۔ جس کے بعد یہ اخبار 'یونینسٹ' پارٹی کا حامی بن گیا اور اس کی ترجمانی کرنے لگا۔

(بحوالہ 'صحافت' از مہدی حسن، انتظام پبلشرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۱۰۲ -)

مولوی سید ممتاز علی کے 'تہذیبِ نسواں' اور 'پھول' میں حسرت کئی سال تک کام کرتے رہے۔
اِن رسائل میں حسرت نے بچوں کے لئے اعلیٰ درجے کی تحریریں پیش کیں جن میں نظمیں، ڈرامے
اور مضامین شامل ہوتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں چراغ حسن حسرت نے لاہور سے ایک بلند پایہ ہفت روزہ 'شیرازہ' کے نام سے
جاری کیا۔ 'شیرازہ' روزنامہ 'احسان' کے زمانے میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں مزاحیہ علمی و ادبی
مضامین ہوتے تھے۔ کئی اعلیٰ درجے کے شمارے اشاعت پذیر ہوئے، اُن میں 'اقبال نمبر' خاص
اہمیت کا حامل ہے۔ یہ رسالہ بھی مالی اور انتظامی مشکلات کا شکار ہوگیا۔

حسرت نے آل انڈیا ریڈیو میں کچھ عرصہ کام کیا، جہاں اُن کے ذمے ریڈیو کی خبروں کے لئے ایسا
ذخیرۂ الفاظ کا مرتب کرنا تھا جو عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ سے پاک ہو۔ یہاں سے بھی مستعفی ہو کر لاہور
آگئے اور سرکاری ہفت روزہ 'پنچایت' کی ادارت سنبھال لی قریباً ڈیڑھ سال اس
سے منسلک رہے۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو حسرت کو آرمی پبلک ریلیشنز میں 'فوجی اخبار(دلی)'
کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ وہ بطور کپتان اس اخبار میں شامل ہوئے۔ فوجی اخبار کچھ عرصے ہی مرتب کیا تھا کہ
کلکتہ چلے گئے اور وہاں فوجی اخبار کی ادارت پر مامور کر دیئے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں حسرت ملایا
بھیج دیئے گئے جہاں فوجیوں کے ایک اردو روزنامہ 'جوان' کی ادارت اُن کے سپرد ہوئی۔ یہ
اخبار رومن رسم الخط میں شائع ہوتا تھا سنگاپور میں حسرت کو مطالعہ کا خوب موقع ملا اور انگریزی
صحافت کے اطوار و مطالعہ کے خوب مواقع میسر آئے۔

فوجی ملازمت حسرت کے مزاج کی نہیں تھی۔ اُن کا اصلی مزاج مجلس طراز ادیب کا
تھا۔ لیکن معاشی مجبوریوں کی بنا پر کبھی وہ صحافت کے خارزاروں میں پھرتے رہے اور کبھی عسکری زندگی
کو اپنی روایت پسندیوں اور وضع داریوں سے ٹکراتے دیکھتے رہے۔ ایک سوال کے جواب میں
انہوں نے کہا تھا:

" لاہور کی محفلوں نے مزید زندگی کو مقروض کر دیا ہے۔ فوج میں تنخواہ کافی ملتی ہے

چاہتا ہوں کچھ پس انداز کروں اول اس لئے کہ قرض اتر جائے گا۔ دوم یہ کہ
چھوٹا سا مکان بنوا لوں گا۔ باقی رہی مسلطانیت یا نازیت۔ میں برطانیہ کی
شہنشاہیت کو جرمنی کی نازیت سے بدتر سمجھتا ہوں اور دونوں پر
لعنت بھیجتا ہوں"[10]

۱۲ فروری ۱۹۴۷ء کو حسرت سنگاپور سے واپس آئے۔ وہ میجر بن چکے تھے۔ سنگاپور کی رنگین و سنگین یادیں اپنے ساتھ لائے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد حسرت مرکزی حکومت کے اخبار 'مہاجرین' میں بطورِ ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۸ء میں لاہور سے روزنامہ 'امروز' جاری ہوا تو اس کی ادارت حسرت کے سپرد ہوئی۔ 'امروز' کا پہلا شمارہ حسرت ہی کی زیرِ ادارت شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کے ذریعے حسرت نے اردو ادب و صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ 'حرف و حکایت' اُن کے کالم کی آخری صورت اور 'سندباد جہازی' مصنف کا آخری قلمی نام تھا۔ موصوف تین سال تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔ حسرت کی آزاد طبیعت نے اخبار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ نزاع کا ایک سبب 'ترقی پسند مصنفین' بھی تھے۔ اُن کی لاہور میں کانفرنس ہوئی۔ حسرت استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے جو خطبہ پڑھا اُس کے مندرجات ترقی پسندی کے موافق مزاج نہ تھے[11]۔ یہیں سے حسرت و تاثیر کا معرکہ بھی رونما ہوا۔ نیز حسرت میاں افتخار الدین اور اُن کی پارٹی کے لوگوں کی باتوں کو دولت کا کرشمہ جان کر پھبتی کستے تھے۔ نازک مزاج شاہاں تابِ سخن نہ دارند۔ اسی اَن بَن میں ۱۱ جولائی ۱۹۵۱ء کو استعفیٰ دے دیا۔

'امروز' کے زمانۂ ادارت میں حسرت و تاثیر کے ادبی مناقشات بھی یادگار چیزیں ہیں۔ 'امروز' اور روزنامہ 'مغربی پاکستان' کے صفحات پر شعروں کی جنگ ادبی معرکوں میں ایک دلچسپ معرکہ رہے۔ اس جنگ سے حسرت کی طبیعت میں جولانی کا پتہ چلتا ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کہنے پر کس طرح قادر تھے۔

؎ اُڑی اُڑی سی ہے رنگت حواس بھی گم ہیں
مرے کلام نے نشتر عجب گھنگولا ہے (حسرت)

۱۹۵۲ء میں ریڈیو پاکستان میں ڈائریکٹر نیشنل پروگرام مقرر ہوئے - چھ ماہ کے بعد نیشنل پروگرام بھی بند ہو گیا۔ ریڈیو کا ماحول اور ذوالفقار علی بخاری کی 'دانشوری' اُن کو پسند نہ آئی اور الگ ہو گئے۔ عبدالمجید سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بدقسمتی سے مجھے دربار داری کے ڈھنگ نہیں آتے۔ اپنے کام سے سروکار رکھتا ہوں، اور مستعدی سے کام کرتا ہوں۔ لیکن یہاں دربار داری مقدم ہے۔ پھر جو لوگ اس معاملہ میں 'ہمہ' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی 'بے ہمہ' ہیں؟"[۱۲]

اس سلسلے میں ممتاز مفتی کی رائے کا درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

"بخاری میں اتنا ظرف نہ تھا کہ وہ چراغ حسن حسرت ایسے عالم کے مقام کو تسلیم کرتے۔ بخاری برادران اگرچہ اعلیٰ درجے کے دانشور تھے لیکن اُن میں طوائف کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ اس وجہ سے ریڈیو میں دربار داری کی رسم رائج ہوئی۔ ادبی بھڑوے تخلیق ہوئے...."[۱۳]

کچھ عرصہ حسرت نے امریکن کمپنی "سلور برڈٹ" کے دارالترجمہ میں کام کیا۔ تاریخ اور جغرافیہ کی نصابی کتابوں کے ترجمے کرتے رہے۔ چراغ حسن حسرت کی زبان ایسی تھی جس پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا۔ پھر اُن کی معلومات نے ترجمے کے اندر وہ چیز پیدا کر دی ہے جو اصل عبارت میں ہوتی ہے۔ حسرت کی ترجمہ شدہ تاریخ کی کتاب کا مسودہ جب نظر ثانی کے لئے حسن عسکری صاحب کے پاس بھیجا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا:

"اگر مولانا حسرت نے زبان میں کوئی غلطی کی ہے تو میرے یہاں اُن کی غلطی بھی صحیح ہوگی۔ اور پھر تاریخ کا مطالعہ میرا مولانا سے زیادہ نہیں ہے"[۱۴]

ترجمے کے سلسلے میں حسرت کو کافی معاوضہ ملتا تھا لیکن اُن کی 'فراخ دستیاں' اور 'یار باشیاں' کناروں سے نکلنے لگیں اور کراچی سے جی بھی بھرنے لگا۔ سائقہ صحت کا مسئلہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا تو لاہور کا ارادہ کر لیا۔ شورش کاشمیری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"صحت خراب ہے معدہ اور جگر نے قلب کے خلاف سازش

کر رکھی ہے۔ جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔ بارہا سوچا کہ

لاہور آجاؤں ...“[15]

کراچی میں کچھ عرصہ 'ماہِ نو' کی ادارت میں بھی شریک رہے۔ ۱۹۵۳ء میں حسرت عارضۂ قلب لے کر لاہور آ گئے۔ آخری چند ماہ 'نوائے وقت' میں 'باغ و بہار' کے نام سے کالم لکھتے رہے، جو وفات تک جاری رہا۔ جس روز چراغ حسن حسرت فوت ہوئے اُن کا آخری کالم جو لاہور کارپوریشن اور پانی کی قلت کے مسئلے پر تھا، اخبار میں موجود تھا۔

۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو حسرت نے لاہور میں وفات پائی۔

بوئے گُل سو گئی، سوزِ فن سو گیا   تو جو سویا دلِ انجمن سو گیا

کتنے شعروں کی شیریں بیاں مر گئیں   کتنے شعلوں کا دیوانہ پن سو گیا

مرگِ حسرت ہے مرگِ روایاتِ فن

تیرے سوتے ہی صدیوں کا فن سو گیا   (سیّد ضمیر جعفری)

چراغ حسن حسرت کی تقریباً پندرہ تصانیف ملتی ہیں، جو متفرق موضوعات پر ہیں۔
ان میں ادبی، تاریخی، سیاسی، سوانحی، اور صحافتی تحریریں شامل ہیں "بغاوت عرب اور کرنل لارنس" تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہیں مل سکی۔ کتاب مذکور کے بارے میں مختلف ادبی رسائل میں تبصرے ضرور نظر سے گزرے ہیں۔ انہی تبصروں کی مدد سے معلومات اکٹھی کی گئی ہیں۔ اسی طرح "سرگزشت اسلام" جو چار حصّوں پر مشتمل ہے، اس کی تیسری جلد مل سکی بقیہ اوّل، دوم اور چہارم تک رسائی حاصل نہیں ہوئی۔ باقی سب کتابیں اگرچہ ایک آدھ بار ہی طبع ہوئیں، دوبارہ شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی اُن کو حاصل کیا گیا اور جائزے میں پیشِ نظر رہیں۔
بچوں کی کتب اور کتابچوں کی تعداد تقریباً چھبیس ۲۶ ہے۔ کسی بھی کتاب پر سن اشاعت درج نہیں۔ "سرکارِ مدینہ" کے اعلیٰ عکسی ایڈیشن شائع ہوئے لیکن اس پر بھی تاریخ اشاعت کا اندراج نہیں۔

چونکہ چراغ حسن حسرت کی تصانیف کے حصول میں کافی دشواری ہے اس لئے یہاں ہر کتاب کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے گا۔

"بغاوتِ عرب اور کرنل لارنس" اردو کتب خانہ لاہور سے ۱۹۳۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ سترہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں خلافتِ عثمانیہ اور جزیرۃ العرب کی تاریخی، مذہبی سیاسی، حیثیت پر مورخانہ بحث کر کے عرب و ترکی میں دوَل اجانب کی سازشوں کا ماجرا بیان کیا گیا ہے۔ اور حجاز، شام، فلسطین اور عراق میں کرنل لارنس کے حیرت انگیز کارناموں کی داستان لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکانِ عثمانی کے خلاف بغاوتِ عرب کی آگ کیوں کر مشتعل ہوئی اور کرنل لارنس نے دورِ حاضر میں اسلام کی سیاسی قوت کو فنا کرنے میں کس قدر خوفناک اور شرمناک حصّہ لیا۔
کتاب کے آخر میں لارنس کی سوانح اور شورشِ افغانستان سے اس کا تعلق بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ حسرت نے بڑی مہارت سے لارنس کے بارے معلومات فراہم کی ہیں۔ تبصرہ نگار نے زبان کی سلاست اور شگفتگی کو کتاب کی خوبی قرار دیا ہے:

"سرگزشتِ اسلام" کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ گمان ہے کہ ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ شائع ہوئی۔ ملک نور الٰہی مالک روزنامہ 'احسان' کے تعاون سے چار حصوں میں طبع ہوئی۔ حصّہ اوّل میں عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے حالات ہیں۔ دوسرے حصّے میں امویوں اور عباسی خلفاء کا تذکرہ ہے۔ تیسرے حصّے میں عباسیوں کے زوال کا ذکر ہے۔ اور اس ضمن میں دیلمیوں، سامانیوں، غزنویوں، سلجوقیوں، فاطمیوں، ایوبیوں، کی داستان بھی آگئی ہے۔ چوتھے حصّے میں اندلس کی اسلامی حکومت اور تیموریوں مملوکوں اور عثمانیوں کی سرگزشت ہے۔ ہر خاندان کی سرگزشت کے خاتمہ پر ایک علیحدہ باب میں اس کے علمی و ادبی کارناموں اور تمدنی خصوصیات کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۳۷ء کے شیرازہ میں تبصرہ نگار نے کتاب کے بارے میں لکھا ہے۔

"سرگزشت اسلام اردو زبان میں مسلمانوں کی پہلی مکمل تاریخ ہے۔ جس میں تاریخ نویسی کے جدید اصولوں کو پوری طرح مدِنظر رکھا گیا ہے۔ اس میں صرف مسلمانوں کی ملکی فتوحات کا ذکر کر کے اس کو جنگ نامہ بنانے کی سعی نہیں کی گئی بلکہ اُن کی علمی فتح مندیوں اور تمدنی ترقی کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا گیا ہے اور اُن کے ہر قسم کے کارنامے بیان کر دیئے ہیں۔"

"سرگزشتِ اسلام" کی زبان اتنی صاف اور شستہ ہے کہ بچے بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ شہروں کے حالات ایسے انداز سے بیان کیئے گئے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو قرطبہ، غرناطہ، بغداد، دمشق کے بازاروں، محلوں، اور کوشکوں میں پاتا ہے۔

"اقبال نامہ" چراغ حسن حسرت کے ادبی و فکاہی ہفت روزہ "شیرازہ" کا اقبال نمبر جولائی ۱۹۳۸ء میں 'اقبال نامہ' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں ہیومنیارٹیک ڈپو ریلوے روڈ لاہور نے اس کو دوبارہ شائع کیا اس مجموعہ میں نہایت اعلیٰ درجے کے سوانحی مضامین ہیں۔ حسرت دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"حضرت مرحوم کی وفات سے کوئی ڈیڑھ مہینہ بھر کے بعد میں نے
اُن کی یادگار میں 'شیرازہ' کا ایک خاص نمبر شائع کیا... میں نے
اُس نمبر کے لئے خاص احباب سے مضامین لکھوائے اور اس
بات کا خیال رکھا کہ تمام مضامین مرحوم کی سیرت اُن کی عادات
اور خیالات سے متعلق ہوں"

'اقبال نامہ' میں کچھ وہ مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو 'شیرازہ' میں علامہ اقبال کے بارے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے، جو اقبال نمبر کے علاوہ تھے۔

مولانا عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، حکیم محمد حسن قرشی کے مضامین نہایت پائے کے ہیں۔ اس کتاب میں اکبر الہ آبادی اور مولانا گرامی کے خطوط بھی شامل ہیں۔ آخر میں کچھ نظمیں بھی شامل کتاب ہیں جس میں حفیظ ہوشیارپوری کی نظم 'نالہ پابند نے' خاص چیز ہے۔

"حیاتِ اقبال" ایک سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب تاج کمپنی نے شائع کی ہے۔ تاریخِ اشاعت اور مصنف کا نام تک درج نہیں۔ علامہ اقبالؒ کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو ہوئی۔ یہ کتاب وفات سے کچھ عرصہ بعد شائع ہوئی۔ مصنف نے صفحہ ۱۴۸ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "یہ سطریں لکھتے وقت 'ارمغانِ حجاز' چھپ رہی تھی" 'ارمغانِ حجاز' کا سن اشاعت نومبر ۱۹۳۸ء ہے۔ رہی کتاب کے مصنف کا سوال تو ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال کے مطابق یہ کتاب چراغ حسن حسرت کی لکھی ہوئی ہے۔[16] کتاب کے اندازِ تحریر، اسلوبِ بیان، شستہ وصاف نثر اور 'شیرازہ'* کے حوالے سے اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ کتاب کسی اور کی ہے۔

بقول مصنف یہ کتاب اُن لوگوں کے بارے لکھی گئی ہے جو اقبالؒ کے بارے میں جاننا تو بہت کچھ چاہتے ہیں لیکن فلسفہ سے واقف نہیں، فارسی سے نابلد ہیں اور معروف مفکرین کے سلسلے میں کچھ نہیں جانتے۔ فارسی کتب کا مجمل سا خاکہ موجود ہے۔ سیدھی سادھی زبان میں ضروری مطالب بیان کر دیئے ہیں۔ اقبالؒ کی سوانح کے ساتھ ساتھ اُن کے خیالات کے ارتقاء اور تصانیف کا ذکر ہے۔

---

* چراغ حسن حسرت کا مشہور ادبی و فکاہی ہفت روزہ۔

اقبالؒ کی سوانح کی کافی تفاصیل دے دی گئی ہیں۔

پہلے باب میں اقبالؒ کے خاندان کا تعارف، اُن کی ابتدائی تعلیم، اساتذہ، اقبالؒ کی ذہانت وطباعی اور مولانا رومیؒ کا ذکر ہے۔

دوسرا باب "اقبال لاہور میں" پر مشتمل ہے۔ "لاہور قدیم وجدید" کا خوب صورت تذکرہ کر کے لکھتے ہیں:

"اگرچہ کسی کے سکھانے اور پڑھانے سے کوئی شخص شاعر یا فلسفی نہیں بن سکتا۔ یہ تو اللہ کی دین ہے، جسے چاہے دے دے۔ البتہ قابل استاد مل جائے تو وہ راستے سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ اسے اقبال کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ پہلے انہیں مولوی میر حسن سا استاد ملا جس نے اُن کی ذہانت کے جوہر کو خوب چمکایا اور سیدھے راستے پر ڈال دیا اُس کا ساتھ چھٹا تو آرنلڈ صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا۔"[17]

لاہور کے مشاعروں میں اقبال کی آمد و رفت۔ "انجمن حمایتِ اسلام" کے جلسوں میں "نالۂ یتیم" جیسی نظموں کی پذیرائی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس باب میں اردو شاعری پر تبصرہ بھی ہے اور اس حوالے سے اقبال کے مزاج و مقام کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ حالی اور آزاد کی نظموں کے بعد اقبالؒ کی نظموں کا ذکر ہے اور ساتھ ہی انگریزی نظموں کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حسرت لکھتے ہیں کہ:

"اُس زمانے میں نادر کاکوروی، سرور جہاں آبادی، خوشی محمد ناظر مشہور شاعر تھے۔ جن کے کلام میں اقبالؒ سے ملتے جلتے خیالات کی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن وہ بھی انہی نظموں میں جن میں اقبال نے کسی نظارے کی تصویر کھینچی ہے۔ ورنہ جہاں کہیں انہوں نے اس انداز سے ہٹ کر کوئی نظم لکھی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا خیال ایک ہی اڑان میں آسمان کو توڑ کر گزر جانا چاہتا ہے۔"[18]

اس باب میں اقبالؒ کے معمولات پر بھی خوب صورت اور دل لبھانے والے انداز میں لکھا گیا ہے۔

تیسرا باب یورپ کے سفر پر ہے۔ کیمبرج میں فلسفہ کی تعلیم پروفیسر میک ٹیگرٹ اور

اور براؤن سے ملاقات ، یورپ میں اقبالؒ کے خیالات میں نمایاں تبدیلی اور فارسی زبان میں شاعری کا آغاز وغیرہ کا ذکر ہے ۔

چوتھا باب 'ولایت سے واپس آنے کے بعد' پر ہے ۔ اقبالؒ کے اوپر مذہبی رنگ کی افزونی اور حالی ، شبلی ، اور اکبر سے اثر پذیری کا ذکر ہے ۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے ۔

پانچواں باب 'اقبال کی شاعری کا نیا دور' کے عنوان سے ہے ۔ شاعروں کی قسمیں ، خودی اور بر سبیل تذکرہ مولانا گرامی کا ذکر بھی آگیا ہے ۔

چھٹا باب خلافت اور کانگرس کی تحریکیں ، ترکوں کے مصائب کا زمانہ ، 'پیام مشرق' لکھنے میں اقبال کی مصروفیت ، اسرار خودی کا ترجمہ (از نکلسن) وغیرہ کا بیان ہے ۔

ساتواں باب 'اقبال سیاست کے میدان میں' کے عنوان کے تحت رقم کیا گیا ہے اور اقبالؒ کی شاعری کی خوبیاں بیان ہوئی ہیں ۔ حسرت لکھتے ہیں :

> "اس میں شک نہیں اُن کی شاعری میں جو خوبیاں ہیں وہ ہندوستان کے اگلے پچھلے کسی شاعر میں نظر نہیں آتیں ۔ اور اُن کا کلام انسان کے دل پر جادو کا اثر کرتا ہے ۔ لیکن جن لوگوں نے صرف اُن کا کلام پڑھا ہے وہ اُن کی خوبیوں کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے ۔ اُن کے علم اور قابلیت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں اُن کے پاس بیٹھنے اور اُن کی باتیں سُننے کا موقع مِلا ہے .... علامہ اقبالؒ بڑے آدمی تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس زمانے کے مسلمانوں میں ایسا کوئی آدمی پیدا نہیں ہوا جس نے اقبالؒ سے زیادہ قوم پر اثر ڈالا ہو ۔ یہ زمانہ اقبال کا زمانہ ہے ۔ آج جو شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے اقبالؒ کی زبان میں کہتا ہے [19]"

اس باب میں اقبالؒ کا لوگوں سے برتاؤ ، اُن کی محفلوں کی جھلک ، بات کرنے کا طریقہ ، سلیقہ ، شعراء کے بارے اقبالؒ کی رائے ۔ کتابوں پر مختصر تبصرہ اور اقبالؒ کے خیالات ونظریات وافکار کا ذکر ہے ۔ جو اگرچہ مختصر ہے لیکن 'اقبالیات' کے ذخیرے میں بڑا وقیع اضافہ ہے ۔

نواں باب وفات کی بابت ہے۔ بیماری کی تکالیف اور اُس سے متعلق دوسرے امور پر بات کی گئی ہے۔

یہ مختصر کتاب اقبالؒ پر لکھی گئی بھاری بھرکم کتابوں پر بھاری ہے۔ واقعات صاف، سلیس اور خوبی سے بیان کر دیئے گئے ہیں۔ رطب و یابس جو کہ سوانحی کتب کا خاصہ ہے، اس کتاب میں بالکل نہیں۔ کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اقبالؒ کے شاعرانہ ارتقاء کے ساتھ ساتھ سوانحی احوال کا ذکر بھی خوش اسلوبی سے کر دیا گیا ہے*۔

"مردم دیدہ" چراغ حسن حسرت کے فکاہی اور ادبی ہفت روزہ "شیرازہ" کی ۱۹۳۷ء کی مختلف اشاعتوں میں یہ خاکے چھپتے رہے۔ سات شخصیات پر مشتمل یہ خاکے ۱۹۳۹ء میں پہلی بار دارالاشاعت پنجاب لاہور کی طرف سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ایک سو اٹھانوے صفحات پر مشتمل اس کتاب میں حسرت نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے، اُن کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور نہایت فنکارانہ مہارت سے اُن کی قلمی تصویریں بنائی ہیں۔ آغائے مؤید الاسلام، خیال عظیم آبادی، آغا حشر کاشمیری، شفاء الملک مرحوم، علامہ اقبالؒ، ظفر علی خان، اور مولانا ابوالکلام آزاد پر حسرت نے ایسے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے کہ پڑھنے والا تحریر کی شگفتگی، اور شخصیت کی دلآویزی میں اس حد تک کھو جاتا ہے کہ خود کو اُس شخصیت کے ساتھ چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ سید امتیاز علی تاج نے لکھا ہے۔ تاج نے اِن خاکوں کو مشاہیر کی سوانح حیات کہا ہے، جن میں واقعات سن وار بیان نہیں کیئے گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مردم دیدہ میں چند ایسے مشاہیر کی زندگی کے متعلق مضامین ہیں جن سے مصنف کے ذاتی طور پر عرصۂ دراز تک مراسم رہے۔ چنانچہ تعلقات اور

---

* "حیات اقبالؒ" عرصہ دراز سے دوبارہ طبع نہیں ہوئی۔ اس لئے اس کے حصول میں دقت کے پیشِ نظر ہر باب کا اجمالی سا خاکہ دے دیا گیا ہے۔

واقفیت کی بنا پر اُن کی شخصیت نے جو تاثر مصنف کے
دل میں پیدا کیا۔ اُسے مصنف نے ان مضامین میں منتخب
واقعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔"

چراغ حسن حسرت کی نثر جس معیار اور وقار کی حامل ہے اس پر اُن کے معاصرین اور بعد میں مختلف ادیبوں نے جس انداز سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے اُس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو نثر میں اُن کا کیا مقام اور مرتبہ ہے۔ امتیاز علی تاج لکھتے ہیں:

"حسرت صاحب کی خوش طبعی اور لطیف و شگفتہ اندازِ بیان نے
کتاب کو اس درجہ دلاویزی بخش دی ہے کہ اُسے ختم کرنے کے
لئے کسی کو بھی ایک سے زیادہ نشست کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"[20]

'مردمِ دیدہ' میں سیرت نگاری کا ایک نیا اسلوب ہے۔ حسرت نے الفاظ کو اس طرح زندہ کیا ہے کہ ہر شخص ہماری آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم خود اس شخص سے محوِ گفتگو ہیں۔ شورش کاشمیری نے لکھا ہے۔

"مردمِ دیدہ میں حسرت کے طرزِ نگارش کی ساری خصوصیتیں جھلکتی ہیں۔ سب
سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جس شخصیت کے متعلق کچھ لکھ دیتے ہیں اُس سے
اُن کی باریک بینی اور فطرت شناسی ظاہر ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے
جملوں میں بڑے بڑے مطالب سمو دیئے ہیں۔ عیب بیان کئے ہیں تو
غزل کے انداز میں۔ حسن بیان کیا ہے تو قصیدہ نہیں لکھا مشاہدہ بیان کیا ہے۔
اور اس میں بکمال و تمام سیرت آگئی ہے۔"[21]

حسرت کی ساری کتابیں عنقا بھی ہو جائیں صرف مردمِ دیدہ باقی رہ جائے تو اُن صاحبِ طرز انشاپرداز ہونے کے لئے کافی ہے۔

"مطائبات" اڑتالیس فکاہی مضامین کا یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء کو اردو اکیڈمی پنجاب لاہور سے شائع ہوا۔ یہ متفرق مضامین مختلف اوقات میں اخبار 'احسان' لاہور میں شائع ہوتے رہے۔

روزانہ اخبارات میں چھپنے والے کالموں کی زندگی صرف ایک دن کی ہوتی ہے، پھر بھی
ان مضامین میں حسرت کا باغ و بہار اسٹائل اس طرح جلوہ گر ہوا ہے، اور ان کی جدت طبع
نے جو کرشمے دکھائے ہیں، انہوں نے ان مضامین کو ایک زمانہ گزرنے کے بعد بھی مرجھانے نہیں دیا۔
ان مضامین کی خوبی کو دیکھ کر احباب نے حسرت کو مجبور کیا کہ وہ ان کو کتابی صورت میں شائع
کریں۔ تمہید میں حسرت نے لکھا ہے کہ وہ یہ مضامین کیا ہیں؟ کچھ سیاسی لطیفے ہیں، کچھ پھبتیاں،
اگر پسند آئیں تو راقم کو دعائے خیر سے یاد کیجئے ورنہ اُن بزرگوں کو کوسیے جنھوں نے مجھے اس
حرکت پر آمادہ کیا؟

اس مجموعے میں بعض مضامین دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی مثلاً "میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں"
ایک بھرپور ادبی طنز ہے۔ "ٹوڈی اور درباری" موسیقی کی اصطلاحات میں ہندوستانی
سیاست پر تبصرہ ہے۔ "تلفظ کی غلطیاں" اپنے اندر ایک لطیف مزاح لئے ہوئے ہے۔
"لفظ پارس کی تحقیق" میں مولانا سیماب اکبرآبادیؒ نے اپنے رسالہ 'شاعر' میں 'بال جبریل' پر
جو سلسلۂ تنقید شروع کیا تھا اس کا حسرت نے بھرپور جواب دیا ہے۔ "بال جبریل پر چند اعتراضات"
"ملا رموزی کی نثر نگاری" اور "ملا رموزی کی شاعری" ادبی تنقیدات کے حوالے سے اہم مضامین ہیں۔

"سنسر اور کرفیو" کے زیر عنوان لکھتے ہیں وہ: ان دنوں یہ غلغلہ بلند ہے کہ سنسر صاحب
کی مقراض احتساب سے کوئی اخبار نہیں بچا۔ جدھر دیکھیے لولی لنگڑی خبریں، اندھے کانے شذرات،
اور لنجے مراسلے نظر آتے ہیں۔ مقالۂ افتتاحیہ اخبار کی ناک سمجھا جاتا ہے لیکن جہاں سنسر کا
وار بھرپور پڑ گیا ناک صاف اڑ گئی ہے۔ نکٹا جیئے برے احوال"[22]
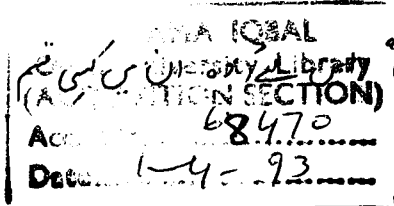
حسرت لکھتے ہیں کہ "ہمارے نتائج افکار بمنزلہ فرزندان کے ہیں (ان میں کسی قسم
کی قطع و برید پسند نہیں کرتے۔

"لفظ پارس کی تحقیق" کے زیر عنوان حسرت علامہ اقبالؒ کے ایک شعر پر سیماب کے
اعتراض کے جواب میں رقمطراز ہیں۔ ڈاکٹر اقبالؒ کا ایک شعر ہے ؎

یوں داد سخن مجھکو دیتے ہیں عراق و پارس - یہ کافر ہندی ہے بے تیغ و سناں خوں ریز

مولانا سیماب اکبرآبادی نے اپنے رسالہ 'شاعر' میں 'بالِ جبریل' پر جو سلسلہ تنقید شروع کر رکھا ہے اس میں انہوں نے اس شعر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"دوسرا مصرع قید وزن و بحر سے خارج ہے اور کچھ ایسا مبہم و مہمل ہے کہ باوجود کوشش اسے صحیح بھی نہیں کیا جا سکتا یعنی عراق و پارس کسی طرح بھی اس مصرع میں نظم نہیں کیے جا سکتے"

چراغ حسن حسرت اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

"ہر شخص جسے فارسی میں کسی قدر دسترس حاصل ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ جناب سیماب کا اعتراض قطعاً غلط ہے۔ وہ غلطی سے 'پارس' کو (بسکون رائے وسین مہملہ) 'پارْس' پڑھتے رہے ہیں۔ اس لئے یہ اعتراض کر بیٹھے چنانچہ راقم الحروف نے مناسب نہ سمجھا کہ سیماب صاحب کی عمر اسی غلط فہمی میں کٹ جائے اور ایک مختصر شذرہ میں اُن سے عرض کر دیا کہ شعر بالکل صحیح ہے۔ لغت کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھ لیجیے آپ پر اپنی غلطی واضح ہو جائے گی۔ 'غیاث اللغات' نے اس لفظ کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "رائے مہملہ از وزن شعر خارج افتد" اور خواجہ حافظ نے بھی اسے بسکون رائے مہملہ باندھا ہے۔ چنانچہ اُن کا مشہور شعر ہے ؎

عراق و پارس گرفتی زشعر خوش حافظ - بیا کہ نوبتِ بغداد و وقت تبریز است [٢٣]

سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ حسرت نے اپنے دلائل پیش کیے اور آخر میں اپنے مخصوص انداز میں لکھا:

"لگے ہاتھوں یہ بھی سُن لیجیے جموں کے ایک رئیس دم بخود کو نجود (ن ج و د) پڑھا کرتے تھے کسی نے اُن کی غلطی کی اصلاح نہ کی، آخر میں اسی غلطی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون - آپ نے 'پارس' کو 'پارْس'

سمجھا تو ہم نے محض اس خیال سے کہ کہیں آپ کا بھی حشر انیس کا سا نہ ہو۔ اس
غلطی کی اصلاح کردی۔ اس پر بگڑنا بے سود ہے۔ فرصت کے اوقات میں
اس لفظ کے ہجے کیا کیجئے پے زبر الف یا رے ساکن سین موقوف پارس۔"[۲۴]

اسی طرح "بالِ جبریل" پر چند اعتراضات" میں حسرت کا طنزیہ انداز نمایاں
ہے۔ صرف طنز ہی نہیں بلکہ اپنی بات کی حمایت میں آٹھ دس فارسی اشعار بھی حوالے کے طور پر
درج کئے ہیں۔ بہار سے شائع ہونے والے رسالے 'فطرت' میں اقبالؒ کی خامیوں پر مضمون
شائع ہوا تو چراغ حسن حسرت نے لکھا:

"فطرت میں مفید مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ لیکن بہت کم ورنہ عام طور
پر رسالے میں "گھسیاریت" کا انداز نمایاں ہے۔ ان لوگوں کو اگر اقبال کے
کلام میں خامیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے تو انہیں معذور سمجھنا چاہیئے۔ جن
لوگوں کو ہمیشہ کھرپے سے تعلق رہا وہ تیر و سنان و خنجر کا تذکرہ کیوں کر سن سکتے ہیں"[۲۵]

شاد عظیم آبادی کی غزل پر مثلاً رموزی کے اعتراضات کا جواب بھی حسرت نے اس طرح
دیا ہے جو کہ اُن کی تنقیدی صلاحیتوں پر دال ہے۔ پھر مثلاً کی ایک نظم پر حسرت کی تنقید
قابلِ مطالعہ بھی ہے اور باعثِ اہتزاز بھی۔

'مطائبات' میں ادبی، سیاسی، سماجی موضوعات پر طنزیہ و مزاحیہ رنگ
میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ خالصتاً مزاحیہ تحریریں بھی موجود ہیں جو وقتی اور ہنگامی
موضوعات پر ہیں۔ لیکن اُن میں بھی تبسم زیرِ لب کی کیفیت جا بجا ملتی ہے۔ مثلاً لاہور کے مچھر،
کھوٹے روپے، سگرٹ رنگترے، اور "بینگن" وغیرہ۔

"دو ڈاکٹر" یہ کتاب ڈاکٹر عالم اور ڈاکٹر ستیہ پال کے متعلق حسرت
کے دو مضامین کا مجموعہ ہے۔ حسرت نے اپنے ہفت روزہ اخبار 'شیرازہ' میں ہندوستان
کی سیاسی شخصیتوں کے متعلق دلچسپ انداز میں اظہارِ خیال کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اُن
کا طنزیہ انداز اِن دو اشخاص کے مطالعہ میں رواں دواں ہے۔

لیڈر حضرات کی بوالعجبیوں کی پردہ دری میں حسرت کو جو سلیقہ حاصل تھا وہ اس کتاب میں موجود ہے۔ الفاظ کی رنگینی اور فقروں کی چستی کے باوجود اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دو شخصیتوں کو قلم سے کچوکے دے رہے ہیں۔

یہ دونوں خاکے 'شیرازہ' مارچ ۱۹۳۹ء اور جون ۱۹۳۹ء کی مختلف اشاعتوں میں سامنے آئے۔ پھر اردو اکیڈمی لاہور نے ۱۹۴۰ء میں کتابی صورت میں شائع کیے۔ کتاب اسّی صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتے ہیں:

"پنجاب کے ان دو مشہور لیڈروں کے سوانحی حالات لکھنے میں اُن کا مقصد کسی کی تنقیص یا تعریف نہیں بلکہ اُن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ صحیح قسم کی سوانح نگاری کو فروغ حاصل ہو اور اس میں وہ بلاشبہ کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ مضامین دو انسانوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں اور ان میں زندگی کی لہر ہے۔ کشمکش اور اضطراب پر دقیق سیاسی رموز مزاح کے لطیف پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ انہیں بار بار پڑھنے میں ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ حسرت صاحب کے 'دلآویز انداز بیان'، سیرت نگاری اور سوانحی تصویر کشی سے ہمارے سوانح نگار بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"

"جدید جغرافیہ پنجاب" یہ کتاب بالاقساط چراغ حسن حسرت کے مشہور ادبی و مکاہی ہفت روزہ 'شیرازہ' میں دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہونا شروع ہوئی۔ بعد میں اپریل ۱۹۴۰ء میں کتابی صورت میں اردو اکیڈمی پنجاب لاہور سے شائع ہوئی۔

مطائبات کا صحیح رنگ اور آہنگ پیش کرنے والی کتاب 'جدید جغرافیہ پنجاب' ہے۔ اس کتاب سے ایک خاص عہد کی صوبائی سیاسیات اور پنجاب کی سیاسی تحریکوں کے اتار چڑھاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

"وہ جو باتیں اکبر الٰہ آبادی نے ذرا وسعت کے ساتھ قومی مسئلوں پر
نپے تلے الفاظ اور شاعرانہ لہجہ میں کہی ہیں۔ وہی اسلوب حسرت نے
صوبائی سیاست کی بوقلمونی کا نقشہ کھینچنے کے لئے مقامی طور پر
اختیار کیا ہے۔ ایک ایسا شخص جو اُس زمانے کے پنجاب کی سیاسیات
کے طلوع و غروب سے ناواقف ہو اس جغرافیہ کا لطف ہی نہیں
اُٹھا سکتا۔ ورنہ یہ ایک ایسا شہ پارہ ہے کہ اردو سطائیات
یا اُردو طنزیات میں اس پائے کی تحریریں شاذ ہی لکھی گئی ہیں"[۳۶]

اس کتاب کی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی دونوں موجود ہیں۔ اُن کے ہر مضمون میں دلاویزی کی کیفیت اور دل نشینی کا پہلو موجود ہے۔ کتاب میں مختلف تراکیب اور مواقات کی جدت کو دیکھ کر ہی حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ "اشتراکی جوالانگھی" "اکالی جنگلات" "سرکار پرستی کی پت جھڑ" "سکندر ماؤنٹ" "میاں کا میلہ" "کوہِ جھولو رام" دریائے سالک وغیرہ۔

نومبر ۱۹۴۰ء میں "ہمایوں" نے لکھا کہ "یہ کتاب دیکھنے اور پڑھنے کے لائق ہے" اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اچھوتے انداز کے اعتبار سے یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اردو زبان میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ کتاب کے مقدمے میں ایم۔ ڈی تاثیر لکھتے ہیں:

"پنجاب کا جغرافیہ" مجازات کے اُن تمام محرکات کا نتیجہ ہے۔
سیاسی جبر سے بچاؤ، معاشی بندشوں سے پناہ، سماجی رکھ رکھاؤ کا
لحاظ اور بیان کے بانکپن کا اقتضاء۔ اس تصنیف میں ان سب
کا اظہار موجود ہے۔ ان تہ بہ تہ پردوں میں سے آزادی کا نور چھن چھن
کر نکل رہا ہے اور محض سیاسی پارٹی بازی کی آزادی نہیں۔ یہ آزادی
ایک ادیب ایک صاحبِ علم و فکر کی آزادی ہے۔ وہ آزادی جو ہر انسان
کا پیدائشی حق ہے۔ آزادیٔ گفتار جس کے بغیر جمہوریت ایک ساعت
بھی زندہ نہیں رہ سکتی"

مولانا صلاح الدین احمد نے ۲۲ جون ۱۹۵۸ء میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں یومِ حسرت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اس کے اسباق اپنے زمانہ کی سیاست کے ایسے دلاویز مرقعے ہیں کہ اُن کی مثال ہمارے ادب میں تو کجا کسی ترقی یافتہ زبان کے ادب میں بھی مشکل سے ہی ملے گی۔"[۲۷]

"کشمیر" دو سو چالیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں مسلمان فرماں رواؤں ہندو راجاؤں، مغل، افغان، سکھ اور ڈوگرہ حکمرانوں کے عہد کے پس منظر میں کشمیر کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ کتاب شیخ عبداللہ کی خواہش پر لکھی گئی۔ کشمیر کی پوری تاریخ سیدھے سادھے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اندازِ تحریر کی خوبی اور دلچسپ واقعات نے کتاب کو "تاریخی" ہونے کے باوجود ادب سے ملا دیا ہے۔

"کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین" اس کتاب میں چراغ حسن حسرت کے اٹھارہ متفرق مضامین ہیں۔ ان میں اکثر مضامین اُن کے مشہور فکاہی اور ادبی ہفت روزہ 'شیرازہ' میں طبع ہوئے۔ چند مضامین اس کتاب کے سوا کہیں شائع نہیں ہوئے۔

یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں اردو اکیڈمی لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں شامل مضامین/افسانے انگریزی زبان سے مستعار ہیں، جنہیں حسرت نے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ "کیلے کا چھلکا" ذل اسکاٹ' کے افسانے سے ماخذ ہے۔ "کلو قانونی" ڈبلیو ڈبلیو جیکبز سے لیا گیا ہے۔ "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" 'او ہنری' کے افسانے کا چربہ ہے۔ بقول حسرت: بعض مضامین کا ترجمہ بالکل نقل مطابق اصل ہے۔ مثلاً "لکڑی کی ٹانگ"

"کتا" چینی افسانہ نگار 'باجن' کے افسانے کا ترجمہ ہے۔ "شیخ جعفر خلاج" ایرانی انشاپرداز 'جمال زادہ' کے قلم کی کرشمہ کاری ہے۔ ان دونوں افسانوں کے ترجمے میں حسرت نے اصل کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں شامل تمام مضامین اور افسانوں میں حسرت کا اپنا اندازِ تحریر برقرار رکھا ہے، خواہ وہ لفظی ترجمہ ہوں یا خیالات کو اپنا لیا گیا ہو۔ ہر جملے پر حسرت کے اسلوب فن کی مہر لگی ہوئی ہے۔

"زرنیخ کے خطوط" یہ کتاب پہلی بار مئی ۱۹۵۱ میں اردو اکیڈمی لاہور نے شائع کی۔

'زرنیخ کے خطوط' حسرت کے قلم طنز رقم کا کارنامہ ہے۔ سیارہ مریخ کا باشندہ 'زرنیخ' سفر کر کے کرۂ ارض پر اترتا ہے اور جو کچھ یہاں مشاہدہ کرتا ہے اسے اپنے ایک دوست کے نام خطوط کی شکل میں بیان کرتا ہے۔ اس مراسلت کو نو مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ سفر، اہلِ زمین، اخبار نویس، جھوٹ، شاعروں اور ادیبوں کی ایک محفل، یونیورسٹی میں ایک دن، اسمبلی میں، عورتوں کا جلسہ اور رخصت۔ حسرت نے انوکھے پیرائے میں موجودہ معاشرت کے بعض پہلوؤں پر طنز کیے ہیں۔ اور چوں کہ یہ خاص میدان ان کا ہے اس لئے وہ اس میں نہایت کامیاب ہوئے ہیں۔

صوفی تبسم کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں،

"چند حقیقتیں ہیں جنہیں طنزیہ روپ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حسرت ان حقیقتوں کو ایک اجنبی کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جو بہت دور کے دیس کا رہنے والا ہے۔ جس کی زبان جس کی عادات، غرض زندگی کی ساری واردات ہم زمین کے باسیوں سے الگ تھلگ ہیں۔ اس کی آنکھوں پر عصبیت کی عینک نہیں، وہ واقعات کو استعجاب سے ضرور دیکھتا ہے، لیکن اس کا مشاہدہ تعصّب کے جذبات سے پاک ہے۔ اس لئے ایک معصوم مگر ہوشیار دیدہ ور کی طرح دیکھتا ہے اور بولتا ہے۔"

اس کتاب میں حسرت کا اپنا اسلوب خاص نمایاں ہے ۔ ہر جملے پر اُن کی چھاپ صاف نظر آتی ہے ۔

'جھوٹ' میں لکھتے ہیں :

"میں اہل زمین کی ذہانت کا اتنا معتقد تو نہیں ، ہاں اُن کے معدے کا ضرور معتقد ہوں ۔ بلکہ میں تو اب اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ جھوٹ کا معدے سے ضرور کوئی نہ کوئی تعلق ہے ۔ معدہ جتنا قوی ہو انسان اتنی ہی کامیابی سے جھوٹ بول سکتا ہے" [۲۸]

"شاعروں اور ادیبوں کی محفل میں" لکھتے ہیں :

"ایک نوجوان شاعر نے جو جدید شعراء کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک نظم پڑھ کر سنائی ۔ اس نظم کو سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ جب شعراء کے نفسیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ طبی معائنہ نہ کرالیا جائے اُن کا کلام سمجھنے کی کوشش بے سود ہے" [۲۹]

کتاب میں مختلف جگہوں ، یا کرداروں کے نام بھی قابل توجہ ہیں ۔ جیسے ایک شہر کا نام ہے 'تنوخ' یا کرداروں کے نام ہیں توبیخ ، سادوس ، بلاطیس وغیرہ ۔ کتاب کو پڑھ کر کہیں کہیں سفر ناموں کا اشتباہ ہوتا ہے ۔ اور کہیں کہیں تمثیلچے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ حسرت کا جادو نگار قلم داستان کے فرضی اجزاء کو یوں ابھارتا ہے کہ قاری حقیقی دنیا میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے ۔

'جھوٹ' اور 'شاعروں اور ادیبوں کی ایک محفل' کتاب کے بہترین مضامین ہیں ۔

"پربت کی بیٹی" سات کہانیوں پر مشتمل یہ کتاب اردو اکیڈیمی لاہور سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی ۔ ہندو دیومالا کی کہانیوں کو حسرت نے ایسی زبان میں لکھا ہے جو موضوع سے گہری مناسبت رکھتی ہے ۔ یوں یہ زبان جس کو عمداً فارسی الفاظ اور تراکیب سے بچایا گیا ہے اجنبی معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن جس رنگ کی یہ کہانیاں ہیں وہ اسی زبان سے کھل سکتا تھا حسرت کی زبان پر استادانہ قدرت کا اظہار اس کتاب میں خوب ہوا ہے ۔ مختلف کیفیات کے اظہار کے لئے الفاظ کا استعمال قابلِ دید ہے ۔

اس کتاب کے بارے میں ابنِ انشاء نے لکھا ہے کہ :

"حسرت کی انشاء پردازی کا ایک اور پہلو اُن کی تصنیف "پربت کی بیٹی" میں ملتا ہے ۔ کہنے کو یہ چند کہانیاں ہیں لیکن اُن کا اصل جوہر خوبیٔ ادا ہے ۔ اردو ادب میں چند ہی تحریریں ہوں گی جو خوب صورتی اور سحر سازی میں اُن کی نثر یا ادب کی حریف ہو سکیں"[۳۰]

اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چراغ حسن حسرت دیو مالا سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ہندی بھاشا میں بھی درخور رکھتے تھے ۔ انہوں نے آسان اردو اور سہل ہندی کے امتزاج سے اردو میں ایک ایسا کلاسیکی کارنامہ سرانجام دیا ہے ۔ جس کو پڑھ کر ذہن میں میراں اور انشاء کا نام آجاتا ہے ۔

مولانا عبدالمجید سالک نے اس کتاب کے بارے لکھا ہے ،

"اس چھوٹی سی کتاب کے صفحے صفحے پر حسرت کی زبان کی ٹھاٹھ اس کے اسلوب کی دلفریب سادگی اور موضوع پر اُس کی حیرت انگیز گرفت کے روشن آثار نظر آتے ہیں ۔ اور ہمیں یہ ناچار ماننا پڑتا ہے کہ آج کل کے زمانہ میں اردو انشاء پردازی کا یہ کمال کسی دوسرے ادیب کو نصیب نہیں"[۳۱]

کتاب کی کہانیوں کے عنوانات پربت کی بیٹی ، ساوتری ، نل دمینتی ، شکنتلا ، گنگا اور امرت کہانی ہیں ۔ "پربت کی بیٹی" کالیداس کی مشہور نظم "کمار سنبھو" کا چربہ ہے ۔ باقی کہانیاں مہا بھارت سے لی گئی ہیں ۔ کتاب کے آغاز میں حسرت نے دس صفحے کا دیباچہ رقم کیا ہے جس میں اِن کہانیوں کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ دیباچے کی آخری سطور میں لکھتے ہیں ۔

"میں نے یہ کہانیاں لکھتے وقت عمداً ایسی زبان استعمال کی ہے جو موضوع سے بڑی مناسبت رکھتی ہے ۔ شاید کچھ لوگوں کو جو عربی و فارسی کی بھاری بھرکم ترکیبوں کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتے اسے اردو سمجھنے میں تامل ہو لیکن میں تو اسے اُردو ہی سمجھتا ہوں"۔

چراغ حسن حسرت کے معاصرین اور اُن کے بعد کے دور میں کوئی ادیب بھی ایسی نثر لکھنے پر قادر نہیں۔ نمونے کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

"جب اُما نے دیکھا کہ اس کا روپ اور جوبن شو جی کے من سے ستی کی یاد کو نہیں مٹا سکا تو اُس نے سارا گہنا اتار ڈالا ست لڑے ہار کو یوں نوچ کے پھینک دیا کہ اس کی رگڑ سے چندن کا لیپ آپ ہی اُتر گیا۔ کان کے بُندوں کو غصے میں یوں نوچا کر کان لہو لہان ہو گئے۔ پھولوں کے جھومروں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اور ریشم کا سوہا جوڑا جس میں سونے کے تار گندھے ہوئے تھے، اتار کے درختوں کی بھوری چھال سے اپنا بدن ڈھانک لیا۔ اور گھر بار چھوڑ کر ایک سنسان جنگل میں جو آبادی سے دور راہ باٹ سے کٹا ہوا تھا کٹیا بنا کے رہنے لگی..."[۳۲]

"مضامین حسرت" یہ کتاب جسے ظہیر الحسن جاوید نے مرتب کیا۔ ۱۹۵۶ء میں شیرازہ پبلشرز ڈائل پارک لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب میں متفرق موضوعات پر پندرہ مضامین اور ایک ڈرامہ 'طاہرہ' کے نام سے شامل ہے۔ پہلا مضمون 'دھوپ چھاؤں' ایک سفر کی روداد ہے جس میں لاہور میرپور اور پونچھ تک کے سفر کے تاثرات ہیں۔ یہ مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں حسرت نے اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں کچھ اشارے کیے ہیں۔ طرزِ تحریر نہایت جاذبِ توجہ ہے۔ اُن کے سفر میں ہم خود شریکِ سفر ہو جاتے ہیں۔ دو چار مقامات پر حسرت نے منظر نگاری پر جو سطور رقم کی ہیں وہ تادیر ذہن میں محفوظ رہتی ہیں:

"پہاڑی دروں سے نکلتے نکلتے سورج کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ اب درخت کے پھننگ اور پہاڑوں کی گھاٹیوں پر دھوپ دم توڑ رہی تھی۔ دریا کی سطح پر سونے کا ایک ورق سا لمحہ بھر کے لئے کانپا اور اس کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔"[۳۳]

کتاب میں شامل کچھ مضامین ادبی موضوعات پر ہیں ۔ جیسے "بزمِ اقبال میں چند لمحے"
"روس اور ایران کا ادبی معرکہ"۔ کچھ طنز یہ جیسے "سفید سمندری بندر" "بادشاہ نے بچہ جنا" وغیرہ
"دیوان سنگھ مفتون" کا خاکہ اس طرح قلم بند کیا گیا ہے کہ اُن کی شخصیت تمام طوفانوں اور
ہنگاموں کے ساتھ چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہے ۔ باقی مضامین میں "ریڈیو سنسا" "کراچی اور لاہور"
"فوجی" "باغ و بہار" "اگر چنگیز کا زندہ ہوتا" "بھاٹ اور سوانگی" شامل کتاب ہیں ۔

کتاب کا دیباچہ عبدالمجید سالک نے لکھا ہے جس میں حسرت کے
ادبی قدوقامت کا تذکرہ ہے اور بر سبیل ذکر شاعرانہ حیثیت پر بھی رائے دی ہے ۔

"حرف و حکایت" یہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ تک چراغ حسن حسرت کے اخباری کالموں
کا انتخاب ہے، جسے سید ضمیر جعفری نے مرتب کیا اور ۱۹۵۶ء میں مکتبۂ کارواں لاہور نے شائع کیا ۔
یہ انتخاب سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے ۔ ان کالموں میں حسرت نے سیاسی،
سماجی، معاشی، معاشرتی، ادبی غرضیکہ دیگر بے شمار موضوعات پر اپنے باغ و بہار قلم
سے خامہ فرسائی کی ہے ۔ سرِ آغاز میں سید ضمیر جعفری صاحب نے لکھا ہے :

"ادب کو اُن سے جو کچھ مل سکا اُس کا بہت بڑا حصّہ صحافت کے واسطے سے
ملا ہے ۔ مگر چوں کہ وہ صحافت بھی ادب ہی کی سطح پر کرتے تھے اس
لئے یہ ذخیرہ بھی اتنا کافی، اتنا رنگا رنگ اور قابلِ قدر ہے کہ ہمارے
تہذیبی اور لسانی ورثے کی عزیز ترین متاع سمجھا جائے گا ۔" ۳۴

"حرف و حکایت" کا مقدمہ عبدالمجید سالک نے لکھا ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

"زبان کی چستی و درستی کے علاوہ ایک خصوصیت حسرت کی یہ ہے کہ
اُن کی تحریر پھبتک اور ناگواری اور تیزی سے بالکل پاک ہوتی ہے ۔ لفظی
ہیر پھیر اور تلازم و مناسبات کے اعتبار سے حسرت اپنی بہت کم
مثالیں رکھتے ہیں ۔ اُن کے کالم میں ادبی محاسن اور لسانی خوبیوں کے
علاوہ معلوماتِ علمی و تاریخی بھی جا بجا پائی جاتی ہیں جو اُن کی وسعتِ
مطالعہ اور حسنِ مذاق کا ثبوت دیتی ہیں ۔" ۳۵

ان کالموں میں حسرت کا اسلوب نگارش، الفاظ و محاورات کی مزاج دانی اور کمالاتِ ادب و ظرافت خوب اجاگر ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہنگامی موضوعات کو بھی اس ادیبانہ شان سے زیبِ قرطاس کیا ہے کہ ان کالموں کو علم و ادب کی دنیا میں ہمیشگی مل گئی ہے۔

"قائدِ اعظم" چھیانوے صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکتبۂ کارواں ایبک روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں۔ چودہ مختلف عنوانات کے تحت چھوٹے چھوٹے باب باندھے گئے ہیں۔ قائد کی ابتدائی زندگی سے لیکر وفات تک نہایت خوب صورت انداز میں لکھی گئی اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اولین ایڈیشنوں میں دو تصاویر بھی شاملِ کتاب تھیں۔ جن میں ایک تصویر میں قائد کو لوگوں کی شکایات سنتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اور دوسری تصویر میں مولانا شبیر احمد عثمانی کو قائد کا جنازہ پڑھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بعد کی اشاعتوں میں سے یہ تصویریں نکال دی گئیں۔

کتاب مختصر ہے لیکن حسرت کے اندازِ بیان نے اس کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

"بچوں کی کتابیں" بچوں کے لئے کتابوں کی تعداد تقریباً چھبیس[۳۶] ہے، جو حسرت نے وقتاً فوقتاً تحریر کیں۔ ان میں پانچ چھ کتابوں کی ضخامت سو صفحات تک ہے۔ باقی کتابچے تیس تیس، چالیس چالیس صفحات پر مشتمل ہیں۔ بارہ کے قریب کتابیں سوانحی ہیں۔ جن میں خلفائے راشدین، کچھ تاریخی شخصیات اور ان کے کارناموں پر اور بقیہ کتابچے تاریخی کہانیوں پر مشتمل ہیں۔

سیرت النبی پر کتاب 'سرکارِ مدینہ' حسرت کی بچوں کے لئے نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں حضورؐ کی زندگی کے مختلف ادوار کو دل نشیں انداز میں لکھا گیا ہے۔ ابواب کے آخر میں کہیں کہیں مولانا حالی کی مسدس کے اشعار بھی درج ہیں۔

سوانحی کتابوں کی تصنیف کا ایک نہایت اہم محرک تھا جس کی بنا پر حسرت نے یہ سلسلہ شروع کیا۔ علامہ اقبالؒ سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے حسرت لکھتے ہیں:

"میں علامہ کی وفات سے آٹھ نو ماہ پہلے حاضر ہوا تو فرمانے لگے، اردو میں

سوانح عمریاں بہت کم تعداد میں شائع ہوئی ہیں ۔ اچھا ہو کہ کوئی
خدا کا بندہ بزرگان سلف کے حالات قلم بند کر کے شائع کرنا
شروع کر دے ۔ بڑی بڑی کتابیں نہ سہی چھوٹی چھوٹی سہی“[۳۶]

گمان غالب ہے کہ چراغ حسن حسرت نے مشاہیر کے بارے میں جو کتابچے رقم کئے ہیں وہ علامہ اقبالؒ کی تحریک پر ہی لکھے گئے ہوں گے ۔

”آفتاب“ ’آفتاب‘ ماہوار مصور اردو رسالہ تھا جو مولانا چراغ حسن حسرت کی ادارت میں جنوری ۱۹۲۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوا ۔ اس رسالے میں ادبی مضامین، نظمیں، غزلیں اور تبصرے وغیرہ شائع ہوتے رہے ۔ ’مردم دیدہ‘ میں حسرت لکھتے ہیں :

”پنجاب فائن آرٹ پریس والے برج لال بالو کو رسالہ نکالنے کا شوق تھا
اور مجھے ایڈیٹر بننے کا ۔ آخر ہم دونوں کے اشتراک سے ۱۹۲۵ء کے اواخر
میں رسالہ آفتاب نکلا“[۳۷]

آفتاب کے پہلے شمارے میں حسرت ’لمعات‘ کے زیر عنوان لکھتے ہیں :

”ہمارا ادبی منشا ہے کہ آفتاب کے صفحات گراں پایہ علمی مضامین سے
مالا مال نظر آئیں ۔ ہم اسے بتدریج بلند ادبی معیار پر لے آئیں گے ۔
بشرطیکہ ملک کے اہل قلم حضرات ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں ؟

یہ رسالہ ڈیڑھ سال سے کم مدت جاری رہا اور پھر بند ہو گیا ۔ حسرت لکھتے ہیں ۔

”پہلے پرچے کے تقریباً سارے مضامین خود لکھے ۔ ایک دو افسانے تھے ، دو تین غزلیں
تین چار ذرا سنجیدہ قسم کے مضامین ۔ پہلا پرچہ تو جیسے تیسے جوں توں کر کے نکل گیا ۔
لیکن ہر مہینے سارے مضامین خود لکھنا ذرا ٹیڑھا کام تھا اس لئے اچھے اچھے
مضمون نگاروں کی جستجو ہوئی“[۳۸]

’آفتاب‘ مشرقی ہندوستان کا اکیلا ماہوار اردو رسالہ تھا جو حسرت کے ہاتھوں جاری ہوا اس رسالے کو

دیکھ کر حسرت کے ادبی ذوق اور مرتبے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سرورق پر جلی حروف میں 'آفتاب' لکھا ہوتا تھا اور نیچے 'آفتاب آمد دلیلِ آفتاب' درج ہوتا تھا۔

"شیرازہ" ۱۹۲۷ء میں کلکتہ میں 'آفتاب' غروب ہوا تو پھر ۱۹۳۶ء میں 'شیرازہ' کی صورت میں لاہور سے طلوع ہوا۔ یہ ادبی و مزاحیہ ہفت روزہ تھا۔ اُس دور کے بڑے ادیبوں نے جس کی قلمی معاونت کی۔ اس میں نہایت وقیع مضامین شائع ہوئے۔ حسرت کی مشہور زمانہ کتب پہلے قسط وار اسی ہفت روزے میں شائع ہوتی رہیں۔ علمی و ادبی حلقوں میں 'شیرازہ' کی بہت پذیرائی ہوئی۔ حسرت نے ۸ جون ۱۹۴۱ء کے شمارے میں لکھا تھا کہ "شیرازہ محض خدمتِ زبان و ادب کی غرض سے جاری ہوا ہے"۔

مولانا عبدالمجید سالک جو اپنے اخبار 'انقلاب' میں 'افکار و حوادث' کا کالم لکھتے تھے 'شیرازہ' میں حوادث و افکار کے عنوان سے لکھنے لگے*۔ یکم دسمبر ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:

"کیا کہوں یہ سُن کر کتنی خوشی ہوئی کہ مولوی "چراغ حسن" نے اپنا اخبار نکال لیا۔ اللہ اس 'شیرازہ' کو کچھ مدت سلامت رکھ کر پھر ایسا بکھیرے کہ ورق ورق ہو جائے اور ہر روز اس کا ایک ایک ورق شائع ہوا کرے۔ یہ بددعا نہیں بلکہ اس کے روزنامہ بن جانے کی دُعا ہے"۔

حسرت 'شیرازہ' ۱۹۳۰ء میں نکالنا چاہتے تھے اور وہ بھی دو اڑھائی سو صفحات کا سہ ماہی رسالہ جو بوجوہ نہ نکل سکا۔ 'شیرازہ' یکم دسمبر ۱۹۳۶ء کے شمارے میں 'ماؤشما' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"کوئی دو سال ہوئے شیرازہ کے بکھرے ہوئے ورق تصور ہی تصور میں پھر مجتمع ہونے لگے۔ اب کے اس کی وضع کچھ اور تھی سولہ یا بیس صفحہ کا ہفتہ وار

---

* چراغ حسن حسرت نے لکھا کہ وہ 'انقلاب' میں وہ افکار و حوادث لکھتے ہیں اور شیرازہ میں 'حوادث و افکار' یوں کہنا چاہیے کہ وہ شیرازہ میں آکر منقلب ہو گئے۔ انقلاب اسی کا نام ہے۔

سیاسی، ادبی اور مذہبی ہفت روزہ۔ شستہ و رفتہ زبان۔ اچھوتے مضامین

لیکن لوگوں کی قدر ناشناسی دل گھٹائے دیتی تھی۔ بلند پایہ ادبی اور سیاسی

اخبار کون پوچھتا ہے۔ ادبی رسالہ ہے تو ایکٹرسوں کی عریاں ٹانگوں کے زور

سے چل سکتا ہے۔ اور سیاسی اخبار جب تک قومی کارکنوں کی تو تکار نہ ہو

کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔"

چھ سال کی تعویق کے بعد 'شیرازہ' کا پہلا شمارہ یکم دسمبر ۱۹۳۶ء کو لاہور سے شائع ہوا۔ اس شمارے میں لکھنے والے معروف ادیب تھے جن میں عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، غلام عباس، حفیظ ہوشیارپوری، حاجی لق لق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

'شیرازہ' کا پہلا شمارہ آنے کے بعد اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اخبارات و رسائل میں اس کے بارے خوش کن آراء شائع ہوئیں۔ شیرازہ کا بڑھ چڑھ کر خیر مقدم کیا گیا۔'انقلاب' نے لکھا:

"ہمارے بھائی مولانا چراغ حسن حسرت کاشمیری ادبی اور صحافتی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز، اور شاعر ہیں۔ مختلف اصنافِ ادب پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور اہلِ ملک ہمیں اُن کی ادیبانہ و ظریفانہ تحریروں کا مطالعہ کا شوق روز افزوں ہے۔ آپ نے حال ہی میں ایک ہفت وار رسالہ شیرازہ کے نام سے جاری کیا ہے۔ جس کا مقصد ادبِ لطیف اور تفریح و تفنن ہے۔"

(بحوالہ شیرازہ ۲۴ جنوری ۱۹۳۷ء۔ ص ۱۱)

'زمیندار' نے خیر مقدمی الفاظ میں لکھا:

"حسرت کاشمیری ایک سحر نگار ادیب اور جادو بیان شاعر کی حیثیت سے دنیائے ادب میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ حسرت صاحب نے اپنے وسیع ادبی ذوق کی تسکین کے لئے ہفتہ وار 'شیرازہ' جاری کیا.... 'شیرازہ' کے اکثر مضامین حسنِ ادب اور لطیف مزاح کے آئینہ دار ہیں.... چونکہ حسرت شعر و ادب سے اصولِ فن کے مطابق واقف ہیں اس لئے آپ کا اخبار بھی

ملاحتِ زبان اور شاعرانہ محاسن کو کبھی نظرانداز نہیں کرتا"

روزناموں کے علاوہ بلند پایہ ادبی رسائل نے بھی 'شیرازہ' کی پذیرائی کی۔ 'ہمایوں' نے لکھا کہ "ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ 'شیرازہ' ذاتیات اور سیاسی جھگڑوں سے بالکل پاک ہے۔ اور مزاحیہ نظموں اور ادبی مضامین کا معیار بلند ہے"۔

۱۹۴۳ء میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے مزاحیہ مضامین کے مجموعے 'کیسر کیاری' کے آغاز میں لکھا ہے کہ "انہی دنوں مولانا چراغ حسن حسرت نے اخبار 'شیرازہ' جاری کیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اماوس کی رات میں افق پر سے بدرِ منیر اُچھل پڑا ہے"۔

'شیرازہ' ساڑھے تین سال سے کچھ اوپر (چند وقفوں کے سوا) شائع ہوتا رہا۔ یکم اگست ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں حسرت لکھتے ہیں،

"اگر 'پابندیٔ وضع' اچھی چیز ہے تو 'شیرازہ' مستحقِ مبارکباد ہے کہ اس نے پورے ساڑھے تین سال تک وضع داری میں فرق نہیں آنے دیا یعنی کبھی وقت پر شائع نہیں ہوا۔"

اس کے باوجود 'شیرازہ' کے جو شمارے منظرِ عام پر آئے وہ اردو ادب میں ایک تاریخی مقام رکھتے ہیں۔ اس ادبی و فکاہی ہفت روزہ نے بہت سے نوخیز ادیبوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ 'شیرازہ' میں مسلسل لکھنے والوں کے علاوہ ایم۔ ڈی۔ تاثیر، عابد علی عابد، میراجی، باری علیگ، کرشن چندر، فیض احمد فیض، ہری چند اختر، سید ضمیر جعفری، اور حمید نظامی وغیرہ کے نام بھی 'شیرازہ' کے قلمی معاونین میں آتے ہیں۔

'شیرازہ' کا 'اقبال نمبر' (مئی ۱۹۳۸ء) 'اقبالیات' کے ذخیرے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی نمبر کچھ اضافوں کے ساتھ 'اقبال نامہ' کے عنوان سے ہوشیار بک ڈپو سے شائع ہوا۔ 'شیرازہ' کا 'اقبال نمبر' بہت مقبول ہوا۔ اس خاص نمبر کی بڑی مانگ ہوئی اور بقول حسرت یہ نمبر صرف ہندوستان میں

---

۵ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے بعد دو ڈھائی ماہ شیرازہ شائع نہیں ہوا۔ پھر ۱۶ فروری ۱۹۴۰ء کو شمارہ بازار میں آیا۔

ہی نہیں بلکہ بعض بیرونی ملکوں میں مقبول ہوا۔ اور دیر تک ہندوستان کے مختلف حصوں کے علاوہ ایران، افغانستان، عراق، وغیرہ کے ممالک سے اس کی فرمائشیں آتی رہیں۔
(بحوالہ نیرنگِ خیال ۱۹۵۹ سالنامہ ص ۲۳۴)

علامہ اقبالؒ کے خادم علی بخش سے حسرت کے استفسارات اسی نمبر میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین بھی معرکے کے مضامین ہیں۔

'ہمایوں' کے ایڈیٹر مولانا حامد علی خاں نے 'شیرازہ' کے اقبال نمبر کے بارے میں لکھا:

"چوں کہ یہ تمام مضامین کم وبیش ان حضرات کے قلم سے نکلے ہیں جن کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا فخر اکثر حاصل ہوتا رہا ہے اس لئے اُن کے آئندہ تذکرہ نگاروں کے لئے یہ پرچہ ایک قابلِ اعتماد راہ نما کا کام دے گا۔" (بحوالہ شیرازہ جون جولائی ۲۳۸)

غرضیکہ 'آفتاب' (کلکتہ) اور 'شیرازہ' (لاہور) چراغ حسن حسرت کی ادبی فتح مندیوں کی عظیم الشان یادگار ہیں۔

چراغ حسن حسرت کی نثری کاوشوں کے مختصر جائزے اور تعارف کے بعد اگر مجموعی طور پر اُن کی نثر پر ایک نظر ڈال لی جائے تو مناسب ہوگا۔ ادب و انشاء کی دنیا میں حسرت نصیر حسین خیال کے بڑے مداح تھے۔ اور انہی کی صحبت میں انشاپردازی کا صحیح ذوق حسرت میں پیدا ہوا۔ گو موصوف کی ابتدائی تحریریں جیسے 'آفتاب' کے کچھ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، اور سجاد حیدر یلدرم کے اندازِ تحریر کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔ 'آفتاب' کی ایک تحریر نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہے:

"آج چشم پھر مائل خونابہ فشانی اور زبان پھر آمادۂ فغاں سنجی، دل کو ہوس ہے کہ عہد پارینہ کی تجدید کرے اور سر سودا زدہ کو تمنا کہ قیس و فرہاد کی داستانیں پھر تازہ کریں۔

؎ عمرہیست کہ آوازۂ منصور کہن شد۔ من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

لیکن اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا احساس دامنگیر ہے اور اپنی کوتاہی و بے بسالی مانع .

ع کمند کوتہ ، بازوئے سست ، و بام بلند[۳۹]

عربی اور فارسی کی گراں بار ترکیبوں ، عسیرالفہم استعاروں ، بدیع الخیال تشبیہوں کے بارے میں نصیر حسین خیال نے چراغ حسن حسرت کو بتایا کہ اس طرز کی عبارتیں قادر الکلامی کی دلیل نہیں بلکہ لکھنے والے کے عجز کا اظہار ہیں . یہ بات حسرت نے پلے باندھ لی اور آسان فطری انداز بیان کی طرف توجہ کی ، اور اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ خود صاحب طرز ادیب بن گئے .

حسرت نے بلاشبہ ہزارہا صفحات تحریر کیے اس کے باوجود ان کی نثر کا معیار ، اور نوکیں بھی گرتے نہیں پایا . روزانہ کالم لکھے ، خاکہ نگاری کی ، ڈرامے لکھے ، افسانے تحریر کیے ، تراجم کیے ، اور سطائبات کا وہ انداز متعارف کرایا جس کا سکہ آج بھی چلتا ہے . ان کی ادبی تحریروں میں تو ایک شانِ دلربائی تھی ہی ، لیکن روزمرہ کی صحافتی تحریروں کو بھی ادبی مقام پر فائز کر دیا . ایک عمر گزرنے کے بعد بھی ان کی صحافتی تحریروں کے رنگوں میں پھیکا پن پیدا نہیں ہوا . وہ آج بھی اسی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں جس طرح اس دور میں باعث بہجت واہتزاز بنتی رہی ہیں°.

حسرت کا رنگ تحریر اتنا پُر لطف اور انوکھا ہے کہ اگر ان تحریروں پر نام نہ بھی درج ہو تب بھی ان کی عبارتوں کی شوخی و خوبی بتائے دیتی ہے کہ میرا خالق کون ہے . ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی متانت اور وضع داری کی جھلک ہوتی ہے . قدیم اسالیب بیان کے ساتھ ، وہ جدید طریقہ ہائے اظہار کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے .

حسرت کی تمام نثری منقولات مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ زبان کی صحت و صفائی کے معاملے میں کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہیں . وہ بات سے بات پیدا کرنے ، زبان کی لچک اور معنویت سے بھرپور فائدہ اٹھانے ، اور الفاظ کے عجیب و غریب پہلو

° فکاہی کالم جن میں مسلسل ایک معیار قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے ان میں بھی حسرت کے ہاں زبان کی خوبیوں کے علاوہ تازگی اور شگفتگی ہر حال میں قائم ہے .

نکالنے میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ جس کی نظیر اُن کے معاصرین میں مشکل سے ہی ملے گی۔

اُن کی روزمرہ تحریریں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مختلف النوع معلومات کا کس قدر وسیع ذخیرہ اُن کے دماغ میں موجود تھا۔ اپنی تحریروں میں قواعدِ زبان اور اسالیبِ فن کی جس طرح وہ پابندی کرتے تھے اُس بارے میں مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"محاورۂ اہلِ زبان کی پابندی حسرت کے لئے مذہب کا حکم رکھتی تھی۔ میں حسرت صاحب سے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ ماڈرن اردو لکھا کرو۔ طلسم ہوشربا اور فسانۂ آزاد کی اردو بلاشبہ پاکیزہ ہے، لیکن زبان کوئی کھڑے پانی کا جوہڑ نہیں، بہتا دریا ہے۔ زمانۂ حال میں اظہار و بیان کی ضرورتیں متقاضی ہیں کہ کچھ نئے محاورے، نئی ترکیبیں اور جملوں کے نئے انداز اختیار کرلئے جائیں۔ لیکن حسرت اپنے مسلک سے ایک انچ بھی انحراف کرنے کو تیار نہ تھے"[۴۹]

خاکہ نگاری میں حسرت نے جس باکمال طریقے سے موقلم کو جنبش دی ہے اُس سے شخصیتوں کے سارے نقوش جگمگانے لگے ہیں۔ تحریر کی شگفتگی اور اندازِ بیان کی ندرت نے شخصیات میں جان ڈال دی ہے۔

چراغ حسن حسرت کی تحریروں کا ایک اور وصف اُن کی جزئیات نگاری پر گرفت ہے وہ موضوع کے تمام ممکنہ پہلوؤں کو اس مہارت اور سلیقے سے بیان کردیں گے کہ مزید کسی شے کی گنجائش نہیں چھوڑیں گے۔ اُن کی تحریروں میں قاری کے لئے ہر مقام پر کوئی نہ کوئی دلچسپی کی چیز ضرور ہوگی۔ اُن کے لکھنے کا انداز بے تکلف گفتگو کا سا ہے۔ جس طرح گفتگو کی محفلوں میں وہ میرِ مجلس رہے اسی طرح تحریر کے تحیّر کدوں میں وہ سب سے جُدا خامہ فرسا نظر آتے ہیں۔

ظرافت اور خوش طبعی حسرت کی تحریروں کی جان ہے۔ بقول شورش کاشمیری:

"وہ ایک منفرد ادیب ہیں اُن کی زبان پر کوئی شخص انگلی نہیں دھرتا۔ جو پڑھتا ہے سر دُھنتا ہے ... اُن کے بولتے ہوئے فقروں میں ایک مسکراہٹ ہوتی ہے اور اُن کی طنزیں شگوفوں کی طرح چٹکتی ہیں"[۵۰]

طنز و مزاح نگار کے لئے اعتدال سے دامن بچانا سخت مشکل کام ہے۔ باوجود اس کے کہ حسرت

زود نویس مزاح نگار تھے ان کا قلم ہمیشہ رکاکت وابتذال سے دور رہا ۔ یہ اُن کی ذہنی پاکیزگی تھی یا زبان پر مہارت و گرفت کہ اُن کے قلم کو کبھی لغزش نہ ہوئی ع ہر بیشہ حرف نگفتن کمال گویائیست ۔ مزاح کو مذاق بنتے دیر ہی کتنی لگتی ہے ۔

حسرت کی سب تحریروں کے بارے میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ سادہ، سلیس، چُست اور درست ہوتی ہیں ۔ اُن کی نثر میں جو چیز وزن، وقار اور وقعت پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی تحریر ہمیشہ ہینک اور ناگواری سے پاک ہوتی ہے ۔ مناسبات و تلازمات کی لہریں جس طرح اُن کے جملوں میں سفر کرتی ہیں وہ دوسرے ادیبوں کے ہاں مفقود ہے ۔

ادبی تحریروں کے علاوہ تاریخی و تحقیقی موضوعات پر بھی انہوں نے بے شمار تحریریں چھوڑی ہیں ۔ اُن میں بھی نثری خوبیاں اُسی حدِ کمال کو چھوتی نظر آتی ہیں جو اُن کی ادبی تحریروں میں نظر آتی ہیں ۔ حتیٰ کہ بچوں کے لئے لکھے گئے کتابچوں کی نثر میں وہی روانی، آن بان، سادگی، بے تکلفی اور موہ لینے والی کیفیت ہے ۔

حسرت نے کسی انداز کی پیروی کرنے کے بجائے نثر میں اپنا ایک خاص انداز ایجاد کیا ۔ جس کو اختیار کرنا یا اُس کی نقل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے ۔ اُن کی خالصتاً ادبی تحریریں ہوں یا صحافتی طرز کی نگارشات وہ اتنی بوقلموں، تازہ کار اور دل کش ہیں کہ "وہ ہمارے تہذیبی اور لسانی ورثے کی قیمتی متاع سمجھی جائیں گی" ۔

چراغ حسن حسرت کی شخصیت کا ایک پہلو تو نثری کاوشوں کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی وجہ سے اردو ادب و صحافت میں وہ ایک بلند مقام پر کرسی نشین ہوئے ۔ دوسرا اہم پہلو اُن کی شعری تخلیقات ہیں جو چند غزلوں کے سوا کبھی مجموعی صورت میں دنیائے ادب کے سامنے نہیں آئیں ۔ نقوش* کے غزل نمبر میں چھ غزلیں اور پھر فنون° کے غزل نمبر میں دو غزلیں (یہ دو غزلیں نقوش کی چھ غزلوں میں بھی شامل تھیں) اشاعت پذیر ہوئیں ۔ اگرچہ حسرت کی شاعری حجم میں کم ہے

---

* نقوش غزل نمبر، فروری ۱۹۶۰ء ص ۲۴۴

° فنون، غزل نمبر (حصہ اول) جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۴۷۰

لیکن ادبی سطح پر وقعت و وقار میں کم نہیں۔ ان شعری واردات کے اظہار میں حسرت کے مزاج اور طبیعت کا بڑا لطیف خوش گوار اور پاکیزہ پہلو سامنے آیا ہے۔ اُن کے نثری کمالات پر تو اکثر ناقدانِ ادب نے اپنی قیمتی آراء کا اظہار کیا ہے لیکن اُن کی منتشر اور غیر مرتب و مدوّن شعری تخلیقات منتظرِ التفات ہی رہیں۔ ایک آدھ مختصر مضمون کے سوا جو اُن کی شعری تخلیقات کے بارے میں لکھا گیا کوئی اور تحریر سامنے نہ آسکی۔ اُس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ حسرت کی شاعری کبھی یکجا اور مرتب صورت میں سامنے نہیں آئی اس لئے اُس کے بارے میں کچھ لکھا جانا بعید از امکان تھا۔

لاہور سے کلکتہ تک کے ادبی رسائل میں موصوف کی شاعری کی اشاعت ہوتی رہی۔ غزلیات کے علاوہ نظموں کی ایک بڑی تعداد جن میں سنجیدہ نظمیں، مزاحیہ نظمیں اور بچوں کے لئے نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اِدھر اُدھر رسائل و اخبارات میں بکھری پڑی رہیں۔ اس مقالہ میں اُن اوراقِ گم گشتہ کو تلاش کر کے ترتیب و تدوین کے زیور سے آراستہ کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ظہیر الحسن جاوید، مرتب، مضامینِ حسرت، لاہور، شیرازہ پبلشرز، ۱۹۵۶ء ص ۲۵۔

۲۔ ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۴ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۲۱۔

۳۔ ایضاً ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء ص ۲۱۔

۴۔ ایضاً

۵۔ شورش کاشمیری، نورتن، لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۶۷ء ص ۸۱۔

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً ص ۶۲۔

۸۔ اردو پنچ، راولپنڈی، شمارہ ۲، ص ۲۰۳۔

۹۔ محمود نظامی، چراغ حسن حسرت، صحیفہ، لاہور، شمارہ ۴، مارچ ۱۹۵۸ء ص ۱۸۸۔

۱۰۔ عاشق حسین بٹالوی، چند یادیں، چند تاثرات، لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۶۹ء ص ۱۹۵۔

۱۱۔ شورش کاشمیری، نورتن، ص ۷۱۔

۱۲۔ نقوش، مکاتیب نمبر، حصۂ اول، لاہور، ادارہ فروغِ اردو، نومبر ۱۹۵۷ء ص ۶۷۷۔

۱۳۔ ممتاز مفتی، اوکھے لوگ، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۶ء ص ۶۷۔

۱۴۔ نصر اللہ خاں، کیا قافلہ جاتا ہے، کراچی، مکتبۂ تہذیب و فن، ۱۹۸۴ء ص ۱۸۶۔

۱۵۔ ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۴ جولائی ۱۹۵۵ء

۱۶۔ وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، لاہور، ۱۹۶۵ء ص ۳۰۵۔

۱۷۔ چراغ حسن حسرت، حیاتِ اقبال، تاج کمپنی لمیٹڈ ص ۲۳۔

۱۸۔ ایضاً ص ۳۲۔

۱۹۔ ایضاً ص ۱۰۸-۱۰۹۔

۲۰۔ چراغ حسن حسرت، مردمِ دیدہ، لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۹ء ص ۴۔

۲۱۔ شورش کاشمیری، نورتن، ص ۸۷

۲۲۔ چراغ حسن حسرت، مطائبات، لاہور اردو اکیڈمی پنجاب، ۱۹۳۹ ص ۱۲۱ -
۲۳۔ ایضاً ص ۹۶ -
۲۴۔ ایضاً ص ۹۷- ۹۸ -
۲۵۔ ایضاً ص ۱۰۱ -
۲۶۔ شورش کاشمیری، نورتن، لاہور، مطبوعات چٹان، ۱۹۶۷ء ص ۸۷ -
۲۷۔ صادق، میرپور آزاد کشمیر، جلد ۳۸ شمارہ ۱، جولائی ۱۹۷۷ء ص ۲۱ -
۲۸۔ چراغ حسن حسرت، زرنیخ کے خطوط، لاہور، اردو اکیڈمی، مئی ۱۹۵۱ء ص ۴۶ -
۲۹۔ ایضاً ص ۵۶ -
۳۰۔ صادق ص ۱۷ -
۳۱۔ صادق ص ۱۴ -
۳۲۔ چراغ حسن حسرت، پربت کی بیٹی، لاہور، اردو اکیڈمی، ۱۹۵۲ء ص ۲۹ -
۳۳۔ مضامین حسرت ص ۶ -
۳۴۔ ضمیر جعفری، حرف و حکایت، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۵۶ء ص ۶ -
۳۵۔ ایضاً ص ۱۱ -
۳۶۔ چراغ حسن حسرت، اقبال نامہ، لاہور، تاج کمپنی ص ۷ -
۳۷۔ چراغ حسن حسرت، مردم دیدہ، لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۹ء ص ۲۷ -
۳۸۔ ایضاً ص ۲۷ -
۳۹۔ آفتاب، کلکتہ، جنوری ۱۹۲۶ء ص ۱ -
۴۰۔ عبدالمجید سالک، یاران کہن، لاہور، مطبوعات چٹان، جولائی ۱۹۶۷ء ص ۲۱۳ -
۴۱۔ شورش کاشمیری، چہرے، لاہور، مطبوعات چٹان، جنوری ۱۹۶۵ء ص ۲۰۸ -

باب دوم

ادبی ماحول اور پس منظر

چراغ حسن حسرت ـــــ ادبی ماحول اور پس منظر

چراغ حسن حسرت کو بچپن ہی سے علمی ادبی ماحول ملا۔ حسرت کے نانا حسن علی حسن نے اُن کو کمسنی ہی میں گود لے لیا تھا۔ دیگر مطالعے کے ساتھ ساتھ فارسی ادب کی کلاسیکی کُتب سے بھی انہیں روشناس کرایا۔ حسن صاحب چوں کہ خود شاعر تھے اس لئے حسرت میں شعر و ادب کے ذوق کا پیدا ہونا فطری بات تھی۔ اسی ذوق و شوق اور مطالعے نے اُن کی سوچ اور فکر میں پختگی پیدا کی، جو آگے چل کر اُن کو بڑا نثر نگار اور شاعر بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ ابتدائی شعری ماحول سے استفادے کے بعد فنِ شعر میں حسرت نے پھر کسی سے رجوع نہیں کیا۔ اور نہ ہی شعر گوئی میں کسی کی شاگردی اختیار کی*۔ زندگی کے اولین ایام میں اُن کی شخصیت پر ادبی ماحول اور شعری مذاق کا جو رنگ چڑھا تھا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتا چلا گیا۔ شعر گوئی کا شوق زمانۂ طالب علمی ہی میں پیدا ہو چکا تھا۔ فی البدیہہ اشعار اور نظمیں لکھنے لگے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے راجہ سکھدیو سنگھ والئی پرنچھ کی گدی نشینی کی تقریب پر دیگر شعراء کی طرح ایک قصیدہ لکھا۔ قصیدے کا ایک شعر محفوظ ہے۔

؎ دریا کے تلاطم سے آواز یہ پیدا ہے۔ سکھدیو مبارک ہو اورنگ جہاں بانی

اپنے گاؤں کے ڈاکیے کے بارے چند شعر، اپنے ایک دوست کی بیوی سے لڑائی پر بھی چند مزاحیہ اشعار ملتے ہیں۔

چراغ حسن حسرت سولہ سترہ سال کی عمر میں شملے گئے اور وہاں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ مضامین اور ذاتی خطوط میں جگہ جگہ فارسی اشعار کا برمحل استعمال اس بات پر دال ہے کہ وہ فارسی ادب اور شعری روایات سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے۔

حسرت پہلی بار ۱۹۲۱ء[1] میں لاہور آئے، پھر ۱۹۲۴ء[2] میں لاہور آکر بی۔ اے کا امتحان دیا۔ ۱۹۲۵ء[3] میں انہوں نے کلکتہ سے ماہوار اردو رسالہ "آفتاب" کے نام سے جاری کیا۔ پہلے شمارے کے

---

* ایک زمانے میں شاد عظیم آبادی کے حلقۂ تلمذ میں آنے کی خواہش کی تھی۔ لیکن بڑھاپے کی وجہ سے انہوں نے معذرت کر لی تھی۔

سارے مضامین حسرت نے خود لکھے۔ مندرجات کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا یا مرتب کوئی پختہ کار ادیب، اور منجھا ہوا شاعر ہے۔ (حالانکہ موصوف کی عمر اس وقت اکیس سال کے لگ بھگ تھی) قلم میں زور اور سوچ میں ایک ادیبانہ رنگینی آچکی تھی۔ چوں کہ حسرت "نئی دنیا" اور "عصرِ جدید" وغیرہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کام کر رہے تھے اس لئے مولانا کے اثرات بھی اُن کے ابتدائی دور کی تحریروں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

ڈھائی تین سال کلکتہ میں قیام کے بعد مولانا ظفر علی خاں کی تحریک پر حسرت ۱۹۲۹ء میں لاہور آگئے۔ ۱۹۳۹ء تک کا زمانہ انہوں نے لاہور میں گزارا۔ اور یہی طویل قیام لاہور ہے جو اُن کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔ "سرگزشتِ اسلام" "اقبالنامہ" "حیاتِ اقبال" "مردم دیدہ" وغیرہ کتب انہی ایام میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ اُن کا مشہور فکاہی ادبی ہفت روزہ "شیرازہ" (یکم دسمبر ۱۹۳۶ء) بھی اسی زمانے میں منظرِ عام پر آیا۔ اسی زمانے میں حسرت صحافتی سرگرمیوں میں بھی مصروف نظر آتے ہیں۔ "انصاف" اور "احسان" سے ساتھ بھی منسلک رہے۔

حسرت کبھی کشمیر، کبھی امرتسر، کبھی دلی اور کبھی بسلسلۂ ملازمت کلکتہ کا سفر کرتے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں سنگاپور میں جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ ہوئے۔ آپ دو سال سے زائد عرصے تک وہاں مقیم رہے اور ہندوستان کے فوجی اخبارات کی ادارت فرماتے رہے۔ وہاں صحافتی ذمہ داریوں کے ساتھ دوستوں کی محفلوں اور علمی و ادبی انجمنوں کو یادگار بناتے رہے۔ سنگاپور میں دوستوں کی ایک انجمن جو "قومؔ" کے نام سے معروف تھی اس کے مرشد چراغ حسن حسرت تھے۔ اس انجمن کی محفلیں ہر روز برپا ہوتیں جن میں حسرت شعر و ادب، تاریخ و تصوف اور طنز و ظرافت پر بے لاگ گفتگو کرتے تھے۔ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے ہر خود غلط نوجوانوں پر یوں تبصرہ فرماتے:

"یہ کیسا دور آگیا ہے لوگ قواعد کے ابتدائی اصول جانے بغیر، عربی و فارسی کی تحصیل کے بغیر، اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کئے بغیر، شعر کی تہذیب اور اس کا مزاج سمجھے بغیر مصنف اور شاعر بن بیٹھے ہیں۔ حسرت قلندر"

میں ایک افسانہ چھپ گیا چلو افسانہ نگار بن گئے۔ "پھلجھڑی" نے ایک غزل
شائع کردی لیجیئے شاعر ہو گئے۔ پھر تحسین باہمی کے حلقے قائم کر کے
جہالت کے حصاروں میں قید ہو کر بیٹھ گئے۔"[۶]

سنگاپور میں حسرت کو مطالعۂ کتب کے مواقع بہت زیادہ میسر آئے۔ بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں۔
جنگ کے زمانے میں سنگاپور کی رومان پرور فضا میں شعر و شاعری اور لطیفہ و بذلہ گوئی کی
محفلیں جاری رہیں۔ اردو شعراء کے تذکرے کا ایک سلسلہ اخبار میں شروع کر دیا۔ بغیر امدادی
کتب کے کئی شعراء کے بارے لکھ دیا۔ یہی نہیں کہ اُن کے اشعار اور اُن پر تبصرے لکھے بلکہ اُن
کی پیدائش اور وفات کی تاریخ اور اُن کے اختلافات پر بھی بحث کرتے رہے۔ اُن کے کلام کی
خصوصیات اور خاص اشعار بحوالہ اس طرح دیتے رہے جیسے متن پیش نظر ہو۔ سید ضمیر جعفری
لکھتے ہیں:

"... مرشد کو اپنے دور کے کسی شاعر کا کوئی شعر شاید ہی یاد ہو مگر
اساتذۂ قدیم کے بے شمار اشعار سینے میں محفوظ تھے۔ بالعموم وہ داغ سے
شروع ہوتے پھر جوں جوں کیف بڑھتا جاتا توں توں غالب و بیدل
سے ہوتے ہوئے عرفی و نظیری، سعدی و حافظ کی طرف اوپر ہی
اوپر بڑھتے جاتے۔"[۷]

سنگاپور کی محفلوں کے تذکرے میں سید ضمیر جعفری آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ہاؤس کی یہ محفلیں مرشد کے کلاسیکی مذاق ادب، اُن کی وسیع معلومات،
دل نشیں ظرافت، شستہ و برجستہ بذلہ سنجی اور برمحل اعلیٰ اشعار کے ترشح
کے باعث ایک سدا بہار دبستانِ علم و دانش کا درجہ رکھتی تھیں۔ باتوں باتوں
میں ہم وہ کچھ سیکھ جاتے جو برسوں کے باقاعدہ اکتساب سے بھی شائد
ہی سیکھ سکتے۔"[۸]

قدیم اساتذہ میں سے وہ گمنام لیکن جید شعراء کو ڈھونڈ نکالتے جن سے متعارف ہونا گویا تاریخ
شعر و ادب سے واقف ہونا ہے۔ اردو شاعری میں حسرت موہانی اور اقبالؒ کے شیفتہ تھے۔

جن شعراء کا وہ مطالعہ کرتے تھے یا جن کو ذاتی طور پر جانتے تھے اُن کو دو خانوں میں بانٹ رکھا تھا "سوجھ بوجھ کا شاعر" اور "بکواس" ۔

چراغ حسن حسرت نے علمی وادبی لحاظ سے زندگی کا زیادہ تر حصہ لاہور میں گزارا اس لئے اُس زمانے کے لاہور اور اس کے علمی وادبی روز وشب کا تذکرہ موصوف کی شخصیت کو سمجھنے اور جاننے میں زیادہ معاون ثابت ہوگا ۔

قیام کلکتہ بھی اُن کی زندگی کے ولولوں اور دلچسپیوں کو سمیٹے ہوئے ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے تعلق رہا ، آغا حشر کاشمیری سے صحبتیں رہیں ۔ اور ہر گام پر شعر وشاعری کے چرچے ہوتے رہے بعد میں جب بھی کسی راز داں نے کلکتہ کا ذکر کیا تو حسرت گنگنانے لگتے :

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں :

" حسرت کے ایام جوانی کا کچھ حصہ کلکتے میں بسر ہوا جہاں انہیں نواب نصیر حسین خیال اور اُن کے بزرگوں کی صحبت میسر آئی پھر مولانا ابوالکلام آزاد سے ربط رہا اور اس مختصر عرصے میں انہوں نے ان بے مثال مواقع سے پورا فائدہ اٹھایا ۔ چنانچہ جوانی میں جو رنگ ان کی طبعِ رسا نے اختیار کر لیا وہ مرورِ ایام کے ساتھ فروغ پاتا گیا اور ادب اردو میں حسرت کے مقام کے تعین میں اس رنگ اور اس کیفیتِ دوشینہ کا بڑا دخل ہے ؟ "[9]

کلکتہ کا ماحول ویسے بھی حسرت کو پسند تھا ایامِ جوانی وہاں بسر ہوئے پھر دورانِ ملازمت کلکتہ جانے کی خواہش کے سلسلے میں اپنے افسر اعلیٰ کرنل مجید ملک کی شان میں ایک فارسی قصیدہ لکھا تشبیب اور گریز کے بعد یہ گزارش کی گئی کہ مجھے کلکتہ بھیج دیا جائے تاکہ ہم رنگِ دوستاں باشم ۔ درخواست رد ہوئی پر حسرت نے ہجو لکھنا شروع کی ایک شعر یوں ہے :

جرمنی بھی ختم ، اُس کے ساتھ جاپانی بھی ختم
تیری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

کلکتہ کے ساتھ حسرت کی بڑی یادیں وابستہ تھیں ۔ حسرت کی اولین ادبی سرگرمیوں کا آغاز بھی کلکتہ سے ماہ نامہ "آفتاب" سے ہوا ۔ کلکتہ اس وقت ہندوستان کا تہذیبی و سیاسی مرکز تھا ۔ کلکتہ میں ذکریا اسٹریٹ کے ریستوران کی وہی حیثیت تھی جو کسی زمانہ میں عرب ہوٹل کی تھی ۔ یہاں دن بھر اردو اور فارسی کے ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا ۔ حسرت جس جگہ بھی گئے وہاں کوئی نہ کوئی عرب ہوٹل تلاش کر لیا ۔

اور سنگاپور کا قیام تو قیامت ہو گیا وہاں کے رومان انگیز ماحول نے گویا اُن کے دل و دماغ میں بسی ہوئی دنیا میں آگ لگا دی ہو ۔ وہاں کی محفلوں کا ذکر معروض تحریر میں کم آیا ہے البتہ مستند راویوں کی زبانی رنگ رلیوں میں ڈوبے ہوئے قصے اور شادی و غم کے افسانے ضرور سننے میں آتے ہیں ۔ احتیاط کا دامن چھوڑے بغیر اگر اس ماحول کی طرف اشارا کرنا مقصود ہو تو غالب کی زبان میں کہنا پڑے گا :

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

لیکن سب سے زیادہ حسرت لاہور کو پسند کرتے تھے اور اُس کی زندگی سے اُن کو عشق تھا ۔ اگرچہ سنگاپور نے اُن کو زندگی کے دو بہترین اور یادگار سال دیئے تھے* ان بہترین دنوں میں بھی وہ مسلسل لاہور کو یاد کرتے اور اس شہرِ بے مثال کے فضائل بیان کرتے رہے ۔ حسرت سنگاپور میں ایک فوجی افسر سے محض اس لئے ناراض ہو گئے کہ اُن کے والد لاہور کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ جا بسے تھے ۔ یہ تھا اُن کا لاہور سے عشق جس نے کلکتے کی شاموں اور سنگاپور کی راتوں کو بھی اُن کی نظر میں ٹکنے نہیں دیا ۔

تمام دنیا میں ادیبوں کے اٹھنے بیٹھنے اور محفلیں جمانے کے کچھ ٹھکانے ہوتے ہیں ۔ جہاں مسلسل نشستیں ہوتی ہیں ، تخلیقات کو ذہنی صفحوں پر ترتیب دیا جاتا ہے ، خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ، تبادلۂ افکار ہوتا ہے ۔ ادبی مہمات کی تگ و تاز کے لئے ہوٹلوں ، کیفوں اور

---

* ... وطن واپس آئے تو جنوب مشرقی ایشیا کی گداز دلنشیں جسم حسیناؤں کا جادو اُن کے سر پر چڑھ کر بول رہا تھا ۔ صبح و شام اُن حریری بدن حوروں کی باتیں کرتے آنکھیں نیلے آسمان کے اُس پار خلاء میں کچھ تلاش کرنے لگتیں ... " (علامت ، لاہور ، فروری ۱۹۹۰ء ص ۹)

ریسٹورانوں کو مسکن بنایا جاتا ہے ۔ کبھی دن کی روشنی میں، کبھی راتوں کی خموشی میں، کبھی بھیگتے موسموں میں، کبھی دھوپ کی تمازتوں میں اور کبھی اداس شاموں میں افکار و خیالات کے نثری اور شعری پیکروں کو بنایا سنوارا جاتا ہے، اور یہیں معاصرانہ چشمکوں کے لئے میدان مہیا ہوتا ہے۔ آخر کار یہی گفتگوئیں اور حکایتیں کتابوں کے صفحات پر نمودار ہو کر تمام دنیا کے شائقین ادب کی آنکھوں کی روشنی بن جاتی ہیں ۔

لندن میں وہ ہوٹل جہاں ڈاکٹر جانسن اپنے دوستوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے اُن کے ساتھ دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی اب وہ ہوٹل محفوظ کر لیا گیا ہے ۔ دُنیا بھر سے لوگ اُس جگہ کو دیکھنے آتے ہیں ۔ اسی سلسلے میں فرانس کو اپنے کیفوں اور چائے خانوں میں ادب و فن کی ترقی و ترویج میں عالمگیر شہرت حاصل ہے ۔ اِن کیفوں میں ادیب اور فلاسفر سالہا سال سے بیٹھتے چلے آ رہے ہیں ۔ نقادانِ ادب کا خیال ہے کہ فرانس کے کیفوں کو ادب کی تاریخ سے نکال دیا جائے تو اُن کا بیشتر ادب ہی نظروں سے اوجھل ہو جائے ۔ مشہور زمانہ فلسفی "سارتر" پیرس کے ایک غیر معروف کیفے "CAFE DE FLORE" میں بیٹھتا تھا اور لوگ سارتر سے ملنے اسی کیفے میں آتے تھے ۔ سارتر کے ساتھ ادب کی تاریخ میں اس گمنام کیفے کا نام بھی مشہور ہو گیا ۔

اسی طرح جب چراغ حسن حسرت کا ذکر آتا ہے تو لاہور میں اُن کی مجلسوں اور محفلوں کے لئے ٹھکانہ "عرب ہوٹل" اور چند دوسری جگہوں کا حوالہ ضرور آتا ہے ۔ لیکن "عرب ہوٹل" اُس زمانے میں ان سب سے زیادہ معروف تھا ۔

اُن مقامات کا ذکر کرنے سے پہلے جہاں حسرت بیٹھتے تھے ، اس زمانے کے لاہور پر ایک نظر ڈال لی جائے تو مناسب ہوگا ۔

لاہور کی علمی و ادبی مجلسوں کو ماضی کے پردے سے جھانک کر دیکھا جائے تو انجمن پنجاب ، جو کہ ڈاکٹر لائیٹنر کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی اس میں آزاد اور حالی کی مساعی سے اردو شاعری ایک نیا رُخ اختیار کر رہی تھی ۔ شعر و شاعری کا مذاق عام لوگوں میں بھی پیدا ہو چلا تھا ۔ کچھ عرصہ بعد

مرزا ارشد گورگانی ، میر فیض الحسن اور سید ناظر حسین ناظم لاہور آ کر مقیم ہوئے تو شاعری کا اچھا
خاصہ چرچا شروع ہو گیا۔ ۱۸۹۰ء میں حکیم شجاع الدین نے ایک اردو بزمِ مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔
"شورِ محشر" اس بزم کا آرگن تھا۔ مشاعرے میں جو شاعری پیش ہوتی وہ شورِ محشر میں شائع کردی
جاتی - اس رسالے کے ایڈیٹر خان احمد حسین خاں تھے۔ اقبالؒ نے طالب علمی کے زمانے میں اپنی
وہ غزل جس کا یہ شعر ہے ، موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے ، اسی مشاعرے کی کسی نشست
میں پڑھی تھی - حکیم شجاع الدین کی وفات کے بعد بھی شائقینِ ادب اُن کے مکان پر جمع ہوتے رہے۔
ان میں علامہ اقبالؒ بھی کبھی کبھار تشریف لاتے۔ ان کے علاوہ سر عبدالقادر ، سر شہاب الدین ،
خلیفہ نظام الدین ، خواجہ رحیم بخش ، شیخ گلاب دین ، مولوی احمد دین* ، مفتی عبداللہ ٹونکی° شامل تھے۔
ان مجلسوں میں بہت سے نوجوانوں کی تربیت ہوئی۔ مرزا نظیم بیگ جو لاہور کے معتدد رئیس تھے ، اُن کے
ہاں بھی علمی و ادبی محفلیں برپا ہوتی رہیں۔ اقبالؒ اور اُن کے دوستوں کی محفل "بازارِ حکیماں" میں جمتی تھی۔ اس
محفل کا مذاق دوسری محفلوں سے جدا تھا۔ یہاں ادبی مسائل کا چرچا تھا ، دوسری جگہوں پر گل و رخسار
کی باتیں تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں نواب ذوالفقار علی خاں پٹیالے سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے تو اُن کی رہائش گاہ
"زر افشاں" ادبی محفلوں کا مرکز بن گئی۔ اقبالؒ کی آمد و رفت اِدھر شروع ہو گئی۔ مولانا گرامی بھی
جالندھر سے تشریف لاتے لگے۔ اس کے علاوہ کئی مجلسیں مختلف لوگوں کے گھروں پر منعقد ہوتیں وہ کوئی
زیادہ اہم تو نہیں تھیں البتہ ایک فضا بنانے میں ضرور معاون ثابت ہوئیں۔

لاہور کی محفلوں کے لئے "مخزن" کا اجراء ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ کئی نامور اس شمع کے
گرد جمع ہو گئے۔ خوشی محمد ناظر ، میر غلام بھیک نیرنگ ، شیخ محمد اکرام ، تلوک چند محروم بزمِ مخزن کے
معروف رکن تھے۔ اس مجلس میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر کی جلوہ ریزیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جو کچھ
اس محفل میں پڑھا جاتا وہ ہر مہینے "مخزن" کے صفحات پر نمودار ہو جاتا۔ ۱۹۱۹ء میں حکیم احمد شجاع
نے "ہزار داستان" شائع کیا۔ پطرس بخاری ، عابد علی عابد ، امتیاز علی تاج ، عبدالمجید سالک اور اختر شیرانی وغیرہ

* مصنف "سرگزشتِ الفاظ" ° موصوف اورنٹیل کالج میں عربی کے پروفیسر تھے۔

اس آسمانِ ادب کے ستارے تھے۔ 'ہزار داستان' بھی مختلف ادیبوں کی صحبت میں ترتیب پاتا رہا۔ اسی زمانے میں میاں بشیر احمد 'ہمایوں' اور حکیم یوسف حسن 'نیرنگِ خیال' منظرِ عام پر لاتے ہیں۔

تاجور نجیب آبادی نے علمی و ادبی محفلوں اور شعر و شاعری کی مجلسوں کو عمومی رنگ دے دیا تھا۔ اب یہ محفلیں ایس۔ پی۔ ایس ہال میں منعقد ہونے لگیں۔ عمومی رنگ آنے کی وجہ سے کچھ عرصے کے بعد اس قسم کی محفلیں باہمی رقابت کی نذر ہو گئیں۔ تاجور نے ادبی ماحول کو جلا دینے کے لئے یہ بڑا کام کیا کہ طویل مدت تک ادبی رسائل شائع کئے اور ذوقِ شعر و ادب کو سیدھی راہ پر ڈال دیا۔ اسی زمانے میں تاجور کی تقلید میں "پنجاب لٹریری لیگ" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے سرپرستوں میں ہر قوم و مذہب کے ادب نواز، سخن فہم اور صاحبِ حیثیت لوگ شامل تھے۔ اس سوسائٹی نے بڑی اہمیت پائی۔ اس میں علامہ اقبال، سر ذوالفقار علی، راجہ نریندر ناتھ، حفیظ جالندھری، میاں بشیر احمد، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، صوفی تبسم، اور چراغ حسن حسرت بھی آنے لگے۔[10]

چراغ حسن حسرت کے دوستوں میں 'نیاز مندانِ لاہور' (تاثیر اور پطرس کا طائفہ)[o] کے علاوہ آغا حشر کاشمیری، باری علیگ، فضل کریم درانی، عاشق حسین بٹالوی، سید ضمیر جعفری، عبداللہ بٹ، عبداللہ ملک، عبدالمجید بھٹی، مرزا محمود نظامی، اختر حسین رائے پوری، سید مظفر حسین شمیم، آغا شورش کاشمیری، کرشن حیدر، شیخ غلام محمد عرف گاما، میاں عبدالواحد عرف السائیکلوپیڈیا، الٰہی بخش سلیم*، محمد فاضل، شیخ محمود (صدر ہوٹل والے) اور لالہ ہیرا چند چڑھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُس زمانے کا لاہور برِصغیر میں ایک منفرد مقام کا حامل تھا۔ یہاں کی علمی و ادبی فضا نے ایک ایسا سحر پھونکا ہوا تھا جس میں ہر کوئی اسیر تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ ایک درجن سے زائد

---

o آل انڈیا ریڈیو میں جانے سے پہلے پطرس بخاری اُس مختصر گروہ کے روحِ رواں تھے جس نے اتفاقیہ 'نیاز مندانِ لاہور' کا نام اختیار کر لیا تھا۔ عبدالرحمٰن چغتائی اور ڈاکٹر تاثیر کی مشترکہ کوشش سے رسالہ 'کاروان' نکلا تھا۔ جس کے پہلے نمبر میں بیشتر مضامین لاہور ہی کے اہلِ قلم نے لکھے تھے۔ دہلی کے 'جامعہ' اور 'ساقی' نے 'کاروان' کے مضمون نگاروں کی زبان پر اعتراض کئے۔ جواب میں مدلّل اور ساکت جواب دیا گیا۔ جس کے نیچے لکھا تھا "نیاز مندانِ لاہور"
بحوالہ: "پطرس بخاری چند یادیں" از عاشق حسین بٹالوی
چٹان۔ لاہور، ۲۲ فروری ۷۱ء، ص ۱۳ -

* یوں تو حسرت کے حلقۂ احباب میں ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی قصہ کہانی یا لطیفہ چسپاں ہے، لیکن الٰہی بخش سلیم جب کسبِ معاش کے سلسلے میں لاہور سے دلّی چلے گئے تو حسرت اُن کا ذکر کرتے وقت ہمیشہ 'الٰہی بخشے سلیم' کہا کرتے تھے۔

کالج تھے اور ہر کالج میں ادبی انجمنوں کا ایک غلغلہ تھا۔ گورنمنٹ کالج کی 'بزمِ اردو' اور اسلامیہ کالج کی 'بزمِ فروغِ اردو' کا بڑا چرچا اور شہرہ تھا۔ 'نیاز مندانِ لاہور' اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ادب کی خدمت کر رہے تھے۔ محمود نظامی لکھتے ہیں:

"جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ اردو ادب کے لئے ایک ہنگامہ خیز عہد تھا۔ ملک میں لکھنے پڑھنے کا چرچا اتنا زیادہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی ادبی جرائد شائع ہوتے تھے اور لاہور کی تو یہ حالت تھی کہ ہر مہینے یہاں سے اگر دو تین پرچوں کے دم توڑنے کی اطلاع ملتی تھی تو ان کی جگہ پانچ چھ نئے پرچوں کے اجراء کا مژدہ بھی دلدادگانِ ادب کو پہنچتا تھا۔"

'انجمن حمایتِ اسلام' جہاں علامہ اقبالؒ نے اپنی معروف نظمیں پیش کیں، اپنے خاص انداز میں مصروفِ کار تھی۔ اردو کے صفِ اوّل کے ادبی رسائل اسی شہر سے شائع ہو رہے تھے۔ 'لاہور کا جغرافیہ' میں پطرس بخاری نے اگرچہ یہ بات تفنّنِ طبع کے لئے لکھی ہے پھر بھی اس کی صداقت سے انکار نہیں لکھتے ہیں "اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔" 'مخزن' ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا، 'ہمایوں' ۱۹۲۲ء 'نیرنگِ خیال' ۱۹۲۴ء، عالمگیر ۱۹۲۷ء، ادبی دنیا ۱۹۲۹ء اسی طرح 'ادبِ لطیف' ۱۹۳۵ء سے میرزا ادیب کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ ان ادبی رسائل کے علاوہ لاہور سے کئی اردو، انگریزی روزنامے بھی شائع ہو رہے تھے۔ انگریزی روزناموں میں 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' اور ٹریبون بڑے اہم اخبار تھے۔ اردو روزناموں میں 'زمیندار' 'انقلاب' 'احسان'* 'شہباز'، 'ملاپ' اور پرتاب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ 'زمیندار' 'احسان' 'شہباز' کے ساتھ تو چراغ حسن حسرت منسلک بھی رہے۔

اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ لاہور نامور ادیبوں، شاعروں اور سیاستدانوں کا مسکن تھا جن میں علامہ اقبالؒ کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، شیخ سر عبدالقادر، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج، مرتضیٰ احمد میکش، احمد شاہ بخاری (پطرس)، محمد دین تاثیر، غلام مصطفےٰ تبسم، حفیظ جالندھری، مولانا صلاح الدین احمد اور چراغ حسن حسرت اہم ہیں۔

---

* 'احسان' میں چراغ حسن حسرت 'مطائبات' کے نام سے مشہور زمانہ کالم لکھتے رہے۔

اساتذہ میں سے جو اورینٹل کالج سے وابستہ تھے مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اور ڈاکٹر سید عبد اللہ وغیرہ۔ اور نوجوان نسل کے ادیبوں میں احسان دانش، اختر شیرانی، میرزا ادیب ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، حمید نظامی، آغا دہلوی۔ اطہر، شورش کاشمیری، میراجی، کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور، محمود نظامی، یوسف ظفر، مختار صدیقی وغیرہ اور کئی دوسرے ادیب اسی لاہور میں مقیم تھے۔ انہی ادیبوں، مجلس طرازوں، اور استادوں کی بدولت لاہور میں ایک منفرد ادبی فضا قائم ہوئی اور انہی کی نگارشات نے ادب میں لاہور کو ایک منفرد مقام عطا کیا۔

اُس زمانے کے ادبی ماحول کے بارے میں نصیر شادانی لکھتے ہیں:

"سنہ ۲۸۔۲۹۔۳۰ لاہور میں بڑے ہنگامے کا عہد تھا شاعروں کے تین گروہ تھے، ایک گروہ مولانا تاجور کا، دوسرا حفیظ جالندھری کا، تیسرا اختر شیرانی کا، ایس۔پی۔ ایس۔ کے ہال میں مشاعرے ہوتے تھے اور یہ تینوں حضرات اپنے اپنے شاگردوں اور مداحوں کی افواج کو لے کر مقابلے کو پہنچتے تھے وہ مشاعرے کیا تھے حقیقت میں شاعروں کے دنگل ہوتے تھے۔"[12]

پطرس بخاری جب انگلستان سے اپنی تعلیم ختم کرکے واپس آئے تو انہوں نے میکلوڈ روڈ پر عطر چند بلڈنگ میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہاں مہینے میں دو بار "اردو مجلس" کا اجلاس ہوتا تھا اس میں اُن کے شاگردوں کے علاوہ بعض احباب بھی شریک ہوتے تھے۔ نامور شاگردوں میں ن۔م۔ راشد، حفیظ ہوشیارپوری اور فیض احمد فیض تھے۔ احباب میں مولانا عبد المجید سالک، سید امتیاز علی تاج، مجید ملک، تاثیر، صوفی تبسم اور چراغ حسن حسرت کے نام قابلِ ذکر ہیں*۔

قیام پاکستان کے بعد ادیبوں کا ایک بڑا ٹھکانہ 'پاک ٹی ہاؤس' تھا۔ اس جگہ پر ادیبوں کے علاوہ طلبہ بھی آتے اور مختلف النوع مجلسیں منعقد کرتے۔ تقسیم سے پہلے 'پاک ٹی ہاؤس' اور عرب ہوٹل میں طالب علم زیادہ آتے تھے۔ تقسیم کے بعد ٹی ہاؤس کُلی طور پر چراغ حسن حسرت، عبد اللہ بٹ اور شورش کاشمیری وغیرہ کا مستقل ٹھکانہ بن گیا۔

چراغ حسن حسرت کی علمی و ادبی محفلوں کا جہاں بھی ذکر آتا ہے، وہاں 'عرب ہوٹل' کا نام ضرور آتا ہے۔

---

* ۸ مئی ۱۹۳۶ء میں 'انجمن پنجاب' کی بنا ڈالی گئی جس کے سرپرست ڈاکٹر اقبال، سر راس مسعود، سر عبد القادر وغیرہ تھے۔ صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی تھے۔ مجلس عاملہ کے اراکین میں اور ادیبوں کے علاوہ چراغ حسن حسرت بھی تھے۔ (بحوالہ: 'ہمایوں' جون ۱۹۳۶ء)

'عرب ہوٹل' کے بارے میں سجاد ہاشمی رقمطراز ہیں:

"یہی ہوٹل ایک زمانے میں اور ایک زمانے تک ادیبانِ لاہور کی چوپال تھا۔ 'عرب ہوٹل' یوں تو ۱۹۲۰ء سے قائم تھا مگر لاہور کے علمی و ادبی حلقوں سے متعارف کرانے کا سہرا حسرت کے سر ہے۔ موصوف نے ۱۹۳۰ء میں اس ہوٹل کو دریافت کیا"۔ ۱۳

سجاد ہاشمی آگے چل کر بیان کرتے ہیں:

"ایک رات جب دوستوں کی بھیڑ چھٹی تو اُن کا جی چائے پینے کو چاہا۔ دہلی دروازے سے نکلے تو آس پاس کے ہوٹل اور قہوہ خانے اپنی دوکانیں بڑھا چکے تھے حسرت صاحب اپنی ترنگ میں چلتے چلتے چوک برف خانہ تک پہنچے تو اسلامیہ کالج کے سامنے واقع اس ہوٹل میں چائے مل گئی۔ 'عرب ہوٹل' کی اس چائے میں جانے کیا جادو تھا کہ حسرت صاحب بعد میں مستقلاً یہیں اٹھ آئے، انہی نے یہاں کھانا اور کباب شروع کرائے، اور انہی کی بدولت یہاں طوطیانِ شہر کا مجمع رہنے لگا"۔ ۱۴

حسرت ایک طویل عرصے تک لاہور کی ادبی محفلوں کے روحِ رواں رہے جب کبھی وہ لاہور سے دور بھی ہوتے تو یہاں کی مجلسیں اور مذاکرے انہیں رہ رہ کر یاد آتے۔ ۱۹۴۰ء میں جب وہ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں دلی گئے تو لاہور اُن کو بار بار اپنی جانب بلاتا رہا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۱ء 'شیرازہ' کے اشارات میں لکھتے ہیں "سات آٹھ ماہ کی مجبوری کے بعد لاہور کی زیارت کرنے کا موقع ملا" لاہور آکر وہ امتیاز علی تاج عبدالمجید سالک، اور عاشق حسین بٹالوی سے ملنے کا ذکر کرتے ہیں۔ اور صوفی تبسم کے دولت کدے کو تو اہلِ طریقت کا ماسن و ماوئ قرار دیتے ہیں - لاہور میں تین دن قیام کے بعد جب دلی واپس جاتے ہیں تو لکھتے ہیں:

؎ عرب ہوٹل کا حج کر کے چلا ہوں۔ کلاہِ فخر کج کر کے چلا ہوں

لاہور کی یادیں جب حسرت کے دل و دماغ پر یلغار کرتی ہیں تو پھر وہ لاہور اور دلی کا مقابلہ و موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ لکھتے ہیں وہ دلی قدیم ہے، شان و شوکت ہے لیکن دل لاہور میں لگتا ہے، طبیعت کو آسودگی ملتی ہے اور علی حزیں کے اشعار زبان پر آ جاتے ہیں۔

زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمے دانم　　ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پائے رہ پیمائے سرگشتگی دیدم　　سرِ شوریدہ بر بالیں، آسائش رسید اینجا

اور اس معاملے میں دلی کا یہ حال ہے۔

سراغِ یک نگاہِ آشنا از کس نمی یابم　　جہاں چوں نرگستاں ہمہ چشم کور مے ماند۔"

حسرت جب دلی میں تھے تو وہاں بھی ہوٹلوں میں بیٹھنا اور مجلس برپا کرنا اُن کا معمول تھا۔ نیرولا کے 'عمر خیام' ہوٹل میں باقاعدگی سے بیٹھتے اور دوستوں کے ساتھ علمی و ادبی گپ شپ میں مصروف رہتے۔ محمود نظامی لکھتے ہیں:

"وہ اُن کے لطائف طبیعت کو بشاش کرتے اور اُن سے شعر و ادب کے بارے میں کئی ایسی باتیں سننے میں آتیں جن سے میرے ادبی ذوق کی تکمیل میں بڑی مدد ملی۔" ۱۵

۱۹۴۲ء میں 'حلقۂ اربابِ ذوق' دلی کی بنیاد ڈالی گئی تو عربک کالج دہلی کی عمارت میں حسرت حلقے کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔

چراغ حسن حسرت ایک زمانے تک 'عرب ہوٹل' (متصل اسلامیہ کالج لاہور) میں جلوہ افروز رہے۔ اس ہوٹل میں چائے اور اور محفل کے دوسرے لوازمات قرض پر مہیا ہوتے۔ زندہ دلانِ لاہور کی مجلسوں کی آماجگاہ، لاہور کے کالجوں کے طلبہ کا مستقل مسکن، ہر نظریے کے حامل اس ہوٹل کی جانب کھنچے آتے۔ کوئی اشتراکی نقطۂ نظر پر بحث کر رہا ہے۔ کوئی سیاست کی وادیوں کی سیر کر رہا ہے اور کرا رہا ہے۔ کہیں شعر و شاعری پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ شیخ، راز، صوفی وغیرہ اسی ہوٹل کے رسیا ہیں۔ حسین بن حافظ کی نظم 'عرب ہوٹل' کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں جو حسرت کی مجلس طرازیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

گرمِ تقریر نظر آتے ہیں جناب حسرت ۔ دفترِ علم کھلا ہے تو عرب ہوٹل میں

جو تھا میدانِ سیاست میں طرار آئے بھرنا — چوکڑی بھول گیا ہے تو عرب ہوٹل میں

کتنا احسان ہے حسرت کا عرب ہوٹل پر — کوئی ہوٹل میں گیا ہے تو عرب ہوٹل میں

یوں تو لاہور ہے سب خلدِ نظر جنتِ گوش — لطف سے وقت کٹا ہے تو عرب ہوٹل میں ١٦

اِن اشعار سے حسرت کی مجلسوں اور اُن کے ادبی مقام و مرتبے کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔
مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"حسرت 'عرب ہوٹل' کی بالائی منزل پر رہتے تھے اور ہوٹل میں اُن کی
مجلس جمتی تھی۔ جہاں بعض احباب اور اسلامیہ کالج کے طلبہ اُن
کے گرد جمع رہتے تھے اُن کی ادبیت اور لطیفہ بازی سے محظوظ ہوتے۔" ١٧

ایک زمانہ آیا جب حسرت کی شادی ہوگئی (١٩٣٧ء) یا بقول غالب پاؤں میں بیڑی ڈال دی گئی
تو پھر عرب ہوٹل کی مجلسوں میں وقفے آنے لگے۔

حسرت کی ادبی سرگرمیوں، سیاسی چشمکوں، صحافتی مناقشوں، اور عالمی سرگرمیوں
پر گفتگو کے لئے 'عرب ہوٹل' خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس حوالے سے کئی اصحابِ قلم نے اس
کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے۔ اُس زمانے کی ادبی محفلوں کو اپنے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی
میں بیان کیا ہے۔ اس بیان میں حسرت کا ذکر سرِ فہرست ہے۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

"... اُن دنوں کا 'عرب ہوٹل' آج کا سا عرب ہوٹل نہ تھا۔ حسرت، ن۔م۔ راشد،
اختر شیرانی، حفیظ ہوشیارپوری، مظفر حسین شمیم، کرشن چندر، باری علیگ روزمرہ
کے حاضر باشوں میں سے تھے۔ کبھی کبھی آنے والوں میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی،
راجہ حسن اختر، مولانا صلاح الدین، پروفیسر علم الدین سالک، سید عبداللہ وغیرہ شامل تھے۔
اس تمام محفل کی روح و رواں حسرت تھے۔ وہ گویا مرکزِ ثقل یا محور تھے اور مجلس
کے جملہ ارکان انہی کے گرد گردش کرتے تھے .... حسرت طبعاً خاموش اور کم آمیز
آدمی تھے۔ بے تکلف دوستوں کے مجمع میں تو وہ باغ و بہار تھے۔" ١٨

شہید گنج کی تحریک (١٩٣٥ء) میں چراغ حسن حسرت 'احسان' کے ایڈیٹر تھے۔ اسی زمانے میں

وہ ایک گورے کے ہاتھوں زخمی بھی ہوئے۔ 'عرب ہوٹل' یارانِ شہر کا مرکز تھا اس مرکز کے صدر نشین حسرت تھے۔ درمیان میں حسرت کرسی نشین ہیں اور اردگرد اُن کے چاہنے والوں کا ہجوم۔ جن میں طلبہ اور شہر کے نوآموز اخبار نویس، وہ کیں اور شناکرے کوئی۔ اندازِ گل افشانیٔ گفتار دیدنی بھی ہے اور شنیدنی بھی۔ نکتہ آفرینیاں، لطائف و ظرائف*، شعری تبصرے، سیاسی جائزے، علمی و ادبی محاکمے، ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

"اکثر ادیب و شاعر کباب کھانے کے لئے دُور دُور سے کھنچے آتے۔ لطفِ طعام کے ساتھ لطفِ کلام حاصل کرتے۔ کس کس کا ذکر کیجئے ایک دو کی بات نہیں اُس وقت کی ادبی انجمنوں کے سبھی ارکان 'عرب ہوٹل' کے گرویدہ تھے۔ قریب ہی اسلامیہ کالج واقع تھا طلبہ کی محفلیں لگتیں۔ ابھی خواتین کا پردہ نہیں اُٹھا تھا حتیٰ کہ ہندو خواتین میں بھی بے حجابانہ اُڑتے پھرنے کا رواج نہ تھا۔ اختر شیرانی کی شاعری کے نسائی روپ کو عجوبہ سمجھا جاتا تھا۔ تمام محفلوں میں غزل ہی کا مزاج پختہ تھا۔ یعنی خوب صورت طلبہ کی محفلوں میں شعر و سخن کے موتی رُولے جاتے۔ حسرت اِن مجلسوں میں از خود رفتہ ہو جاتے۔ انہوں نے خندہ ہائے لب، عشوہ ہائے قامت اور پیالہ ہائے چشم سے 'حرف و حکایت' چننے میں کبھی احتراز نہیں کیا۔ بلکہ بے محابا ہو گئے۔ لیکن از خود رفتگی اور دیوانگی کے باوصف سب کے محترم تھے اور کوئی شخص

---

* 'عرب ہوٹل' میں ہر روز نئے لطیفوں سے محفل جمتی تھی۔ ایک لطیفہ جو اُس زمانے کی یادگار ہے۔ ایک مرتبہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک ہوٹل میں جلوہ افروز تھے۔ شاہ جی نے کہا سالک اور حسرت، آپ دونوں بڑے اہلِ زبان بنتے ہیں اور زبانِ اردو کے کان کترتے ہیں۔ ذرا یہ تو فرمائیے 'گگے زئی' کی جمع کیا ہے۔ اور سالک صاحب آپ تو خود بھی ککے زئی ہیں۔ دونوں حضرات نے یک زباں ہو کر کہا حضور یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ محلے ککے زئیاں کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ بخاری صاحب نے کہا یہی تو رونا ہے کہ تم بھی یہ بات کہتے ہو۔ ارے بھائی ککے زئی کی جمع تین ہیں: ۱. ککاکزہ ۲. کیاکزہ ۳. کواکزہ۔ حسرت اور سالک شاہ جی کی ذہانت پر عش عش کر اٹھے۔

بھی اُن کے احترام کو ترک کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا؟ ۱۹

اس اقتباس میں حسرت کی تصویر زندہ ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ہم خود کو اُس دور میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ دورانِ جنگ حسرت سنگاپور سے ایک آدھ بار کی رخصت پر لاہور آئے تو عرب ہوٹل کو فراموش نہیں کیا۔ باقاعدہ مجلس آراستہ ہوتی رہی۔ میجر کی وردی پہن کر آئے تو دوست احباب نے جی بھر کر تعریف کی اور بعض دوستوں نے موصوف کو یہاں تک کہہ دیا کہ آپ تو الوری کا قصیدہ معلوم ہوتے ہیں۔

چراغ حسن حسرت کے مذاق کی آبیاری میں عرب ہوٹل بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حسرت کی ذات میں قدرت نے جو علمی و ادبی خصوصیتیں بھر دی تھیں اُن کا بہترین اظہار اپنی مجلسوں میں ہوتا رہا۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ " وہ ایک قابل مصنف اعلیٰ درجے کے شاعر، صاحب طرز مزاح نویس، بلند پایہ صحافی، اور زبانِ اردو کے مستند ادیب تھے۔ اپنی ذات میں وہ ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ جو لائق اور فاضل اصحاب پر مشتمل ہو۔ وسعتِ معلومات کے لحاظ سے اُن کا دماغ ایک انسائیکلو پیڈیا تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ میں مصوری، اور موسیقی کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھے۔ مذاہبِ عالم کی نہایت اچھی واقفیت رکھتے تھے" ۲۰

ان مختلف الجہت پہلوؤں کا اظہار حسرت نے کئی سال تک 'عرب ہوٹل' میں محفلیں برپا کر کے کیا اور اپنا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا۔ جو ادب کی خدمت میں کوشاں رہا۔ کرشن چندر نے لکھا ہے کہ:

> "لاہور میں انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ 'عرب ہوٹل' کے قہوہ خانے میں بسر کیا اور اگر یہ کہا جائے کہ 'عرب ہوٹل' لاہور کی بین الاقوامی شہرت محض حسرت کے طفیل تھی تو بے جا نہ ہوگا۔" ۲۱

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک کا زمانہ 'عرب ہوٹل' کے عروج کا زمانہ ہے۔ 'عرب ہوٹل' کے بعد شاعروں، ادیبوں کا دوسرا اڈہ نگینہ بیکری تھی*۔ پہلے تو یہ دوکان سیاسی مناظرہ بازوں کی پناہ گاہ تھی لیکن جب 'عرب ہوٹل' کے میر مجلس چراغ حسن حسرت سرکاری ملازمت میں چلے گئے تو ان کے جاتے ہی مجلس بھی درہم برہم ہوگئی اور بعض اصحاب نے نگینہ بیکری کو مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔

---

* حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۱۹۴۷ء میں حسرت سنگاپور سے واپس آئے۔ ۱۹۴۸ء میں 'امروز' کے پہلے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ لاہور میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ ۱۹۵۲ء میں ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ کچھ عرصہ امریکن پبلشنگ کمپنی کے لئے درسی کتابوں کے ترجمے کیئے۔ ماہِ نو سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۵۳ء میں بیمار ہو کر لاہور واپس آ گئے۔ بیماریٔ دل کے باوجود کراچی سے واپس آ کر لاہور 'کافی ہاؤس' میں محفلیں آراستہ کیں، ہر شام نہایت التزام سے 'کافی ہاؤس' میں تشریف لاتے رہے۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

"وہ رات ایک ڈیڑھ بجے سے پہلے گھر جانے کے عادی نہ تھے کافی ہاؤس' دس بجے بند ہوتا تو چینی لنچ ہوم میں بیٹھ جاتے، وہاں سے اٹھتے تو پاک ٹی ہاؤس کا رخ کرتے وہ بند ہوتا تو میکلوڈ روڈ کے کسی ریسٹوران میں جا بیٹھتے۔ بس انہیں دو چار ہم نشینوں کی ضرورت ہوتی اور وہ لاہور میں موجود ہی ہیں۔"[۲۳]

'عرب ہوٹل' اور 'کافی ہاؤس' میں تو حسرت مستقلاً عرصہ دراز تک بیٹھتے رہے۔ ان جگہوں کے علاوہ وہ جہاں بھی گئے وہاں ایک روایت مجبور ہو کر آئے۔ ہر مجلس کے صدر نشین حسرت ہی رہے۔ وہ مجلس اور محفلیں بڑی یادگار اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ حسرت کو 'دائرۃ المعارف' بے جا نہیں کہا گیا، جہاں سے شائقین ادب اور خوشہ چیں اپنی اپنی پسند کی چیزیں اکٹھی کرتے تھے۔ اسی ماحول اور انہی مجلسوں میں حسرت کی ناقدانہ بصیرت، انشاپردازی، اور نغزگو شاعر ہونے کے جوہر کھلتے ہیں۔

---

* 'نگینہ بیکری' نیلا گنبد کے چوک سے پرانی انارکلی کے بائیں بازو کی چھٹی یا ساتویں دکان میں ہے (کافی ہاؤس، چینی لنچ ہوم بعد میں کھلے) 'عرب ہوٹل' کے کباب مشہور تھے اور نگینہ بیکری کی چائے کا چرچا تھا۔ عرب ہوٹل میں بیٹھنے والوں میں حسرت، حمید نظامی، عاشق چغتائی، باری علیگ، مرتضیٰ احمد میکش، اختر شیرانی اور مسلمان اخباروں کا عملۂ ادارت بیٹھتا تھا۔ نگینہ بیکری میں بیٹھنے والوں میں تاجور نجیب آبادی، عبداللہ، ڈاکٹر عنایت اللہ، صلاح الدین احمد، گوپال متل، اور حلقۂ اربابِ ذوق کے کچھ نوجوان۔ 'عرب ہوٹل' اسلامیہ کالج کے طلبہ کی وجہ سے چل رہا تھا۔ اور نگینہ بیکری اورینٹل کالج اور لاء کالج کے نوجوانوں کی آمد و رفت سے آباد تھی۔

یہ تھا وہ ادبی ماحول اور زمانہ جس میں حسرت بحیثیت شاعر، نثر نگار اور صحافی منظر عام پر آئے۔ گو انہوں نے عمر کم پائی لیکن ادب و صحافت کو وہ جو کچھ دے گئے اُس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ صحافتی زندگی اور اُس کی بوالعجبیوں نے اُن کی ادبی زندگی کو نقصان ہی پہنچایا۔ صحافت کے خارزار میں اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا موقع کم ملا وہ ادب کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے اور کئی منصوبے بھی اُن کے پیش نظر تھے لیکن بقول حفیظ جالندھری:

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

حسرت اپنے ادبی منصوبوں کو شرمندۂ تعبیر کئے بغیر اس مجلس سے رخصت ہو گئے۔

چراغ حسن حسرت بنیادی طور پر ادیب تھے۔ اُن کی سوچ اور فکر ادیبانہ تھی۔ اسی لئے اُن کی صحافتی تحریریں بھی آج تک اپنا رنگ اور روپ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ صحافت تو اُن کی شخصیت کا ایک پہلو تھا، جو ضرورتاً اُن پر حاوی ہو گئی تھی۔ ورنہ جب کبھی ایسی موقعہ ملتا وہ ادب کے گلکدوں کی طرف نکل جاتے۔ کبھی مصور رسالہ 'آفتاب' جاری کرتے ہیں تو کبھی 'شیرازہ'۔ بقول گوپال متل وہ اہل قلم زیادہ تھے اور صحافی کم۔[۲۳] حسرت اور اُس زمانے کے کچھ دوسرے ادیب ضرورتاً یا اتفاقاً صحافت میں داخل ہو گئے تھے۔ صحافتی ذمہ داریوں کا بوجھ اُن پر نہ پڑتا تو وہ یقیناً یکسوئی سے شعر و ادب کی طرف توجہ دیتے لیکن اُن کی 'نامرادیوں' اور 'آرزو کے غموں' نے مہلت ہی نہ دی کہ وہ جو کچھ سوچتے اور گنگناتے ہیں اس کو زیب قرطاس بھی کر سکیں۔ موصوف کا شعر اُن کے حسب حال ہے:

غم آرزو کو نہ تازہ کر دل بے خبر یہ وہ آگ ہے۔ جو سلگ اٹھی تو سلگ اٹھی، جو دبی رہی تو دبی رہی

شاعری کی صورت میں حسرت نے ادبی دنیا کو جو کچھ دیا اُس میں سے کچھ تو اخبارات و رسائل میں دب کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ دوست احباب کے حافظوں میں محفوظ تھا اور وہ چل بسے اور کچھ مجلسوں اور محفلوں کی سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں اڑ گیا۔ جو باقی بچا اس جگر لخت لخت کو سینت سنبھال کر یکجا کیا گیا ہے اس میں کچھ غزلیں، نظمیں، مضاحیہ کلام، بچوں کے لئے نظمیں اور متفرق اشعار شامل ہیں:

حوالہ جات

۱۔ چراغ حسن حسرت، مردم دیدہ، لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۹ء ص ۴۶۔

۲۔ شعرائے اردو (جدید)، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۶۹ء ص ۶۴۲۔

۳۔ مردم دیدہ، ص ۲۷۔

۴۔ سید ضمیر جعفری سے تصدیق کی گئی جو حسرت کے ساتھ سنگاپور میں مقیم رہے اور ان کے شب و روز کے ساتھی بھی۔

۵۔ سید ضمیر جعفری، کتابی چہرے، راولپنڈی، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء ص ۱۲۔

۶۔ ایضاً ص ۱۹۔

۷۔ ایضاً ص ۲۶۔

۸۔ ایضاً ص ۲۶۔

۹۔ روزنامہ آفاق، لاہور، ۴ جولائی ۱۹۵۵ء

۱۰۔ کلیم احمد شجاع، لاہور کی ادبی مجلس، لاہور، چٹان، ۹ اپریل ۱۹۶۵ء

۱۱۔ محمود نظامی، 'چراغ حسن حسرت'، صحیفہ، لاہور، مارچ ۱۹۵۸ء ص ۱۸۸

۱۲۔ فنون، لاہور، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۸ء ص ۱۱۲۔

۱۳۔ ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۶ ستمبر ۱۹۷۱ء ص ۱۴۔

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ صحیفہ، لاہور، ص ۱۹۷۔

۱۶۔ شیرازہ، لاہور ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء

۱۷۔ عبدالمجید سالک، یارانِ کہن، لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۵۵ء ص ۲۱۲

۱۸۔ عاشق حسین بٹالوی، چند یادیں چند تاثرات، لاہور، آئینہ ادب ۱۹۶۹ء ص ۱۹۲

۱۹۔ شورش کاشمیری، حسرت کی باتیں، لاہور، چٹان، ۴ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۱۲۔

۲۰۔ نیرنگِ خیال، لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۲۲۹۔

۲۱۔ روزنامہ تعمیر، راولپنڈی، ۹ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۶

۲۲۔ ہفت روزہ چٹان، لاہور، جولائی ۱۹۵۵ء ص ۱۳

۲۳۔ گوپال متل، لاہور کا جو ذکر کیا، لاہور، مکتبۂ اردو، س۔ن ص ۶۲۔

باب سوم

شخصیت اور ادبی نظریات

حسرت کی شخصیت اور ادبی نظریات

چراغ حسن حسرت اپنے زمانے کے بہت بڑے صحافی، مضمون نگار، مترجم، تاریخ دان*، ماہرِ لسانیات اور خوش فکر شاعر تھے۔ وہ تمام عمر صحافت کے ساتھ وابستہ رہے اور پھر اسی خارزاروں میں اپنی زندگی بسر کردی۔ اُن کو بہت کم مواقع میسر آئے کہ وہ شاعری کے گلکدوں کی سیر کرتے اور اپنے جذبات و خیالات کو شعر کا لباس پہناتے۔ اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں "چراغ حسن حسرت کی اخبار نویسی نے اُن کی شاعری، اور شاعری سے دلچسپی نے اخبار نویسی کو نقصان پہنچایا!" یہ تو درست ہے کہ اخبار نویسی نے اُن کی شاعری کو نقصان پہنچایا، البتہ یہ بات محلِ نظر ہے کہ شاعری نے اخبار نویسی کو نقصان پہنچایا۔ شاعری کی وجہ سے تو اُن کی اخبار نویسی میں ایک ادیبانہ شان نظر آتی ہے جو مستقل اہمیت کی حامل ہے۔ ورنہ آج کی صحافتی تحریریں کل اپنا رنگ و روغن کھو بیٹھتی ہیں۔ برنارڈ شا صحافت سے اس لئے متنفر تھا کہ وہ ذہانت کو تباہ کردیتی ہے۔ اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ صحافت بڑے بڑے ذہین افراد کو کھا جاتی ہے۔ یقیناً کچھ اصحاب اس میدان میں بڑا نام پیدا کر لیتے ہیں، لیکن اُس مقام سے دُور چلے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر بہتر طریقے سے منوا سکتے ہیں۔

چراغ حسن حسرت بنیادی طور پر شاعر تھے اُن کا مزاج، افتادِ طبع، سوچ اور فکر سب کچھ شاعرانہ تھی۔ اکثر مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ انہیں روزانہ کی کالم نویسی سے جب بھی فرصت ملی اُن کے اندر کا چھپا ہوا شاعر کسی غزل، نظم یا متفرق شعر کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ حقیقت میں شعر ہی اُن کا پر پرواز اور سازو براق تھا۔ اُن کے کالم اور دوسری نثری تحریریں بھی اپنے اندر ایک شاعرانہ شان اور ادبی شکوہ رکھتی ہیں۔ بقول سید ضمیر جعفری

"ادب کو اُن سے جو کچھ مل سکا اُس کا بہت بڑا حصہ صحافت کے واسطے سے ملا ہے، مگر چوں کہ وہ صحافت بھی ادب ہی کی سطح پر کرتے تھے اس لئے یہ ذخیرہ اتنا کافی، اتنا رنگا رنگ اور قابلِ قدر ہے کہ ہمارے

---

* سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں "تاریخ اُن کا خاص مضمون تھا۔ سرسری جو کچھ بولتے تاریخ معلوم ہوتا جو کچھ لکھتے تاریخ بن جاتا۔"
(چہرے، سید ضمیر جعفری ۱۹۷۶ء ص ۲۷)

تہذیب و لسانی ورثے کی عزیز ترین متاع سمجھا جائے گا۔[2]

چراغ حسن حسرت کی شاعری کا قلیل سرمایہ بھی مرتب صورت میں کبھی سامنے نہیں آیا اس لئے اُن کی شاعرانہ حیثیت کو کبھی متعین نہیں کیا گیا۔ پیشِ نظر شعری سرمائے کو دیکھ کر بلاشک وشبہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ یکسوئی سے فکرِ سخن کرتے تو اپنے بہت سے معاصرین سے آگے نکل جاتے۔

وہ اُن میں ادب کا ذوق معراج پر تھا، زبان و بیان دونوں کے دھنی تھے نثر و نظم اُن کے مرکب تھے۔ اس کمالِ فن نے اُن میں انا پیدا کی[3] حسرت نے اپنی عملی زندگی کا آغاز مدرّس کی حیثیت سے کیا پھر وہ تمام عمر استاد ہی رہے اور کوئی دوسرا اُن کی نظر میں جچ نہ سکا۔ وہ ہر جگہ صدر نشین ہی رہے۔ فارسی اور اردو شاعری کا تمام سرمایہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ اور وہ بڑی حد تک اُن کے حافظے کا حصّہ بن گیا تھا۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

"قدماء کے ادب پر انہیں درخورِ وافی حاصل تھا۔ وہ کلاسیکی لٹریچر کے رگ و ریشہ سے آشنا تھے.... ولی دکنی سے لے کر غالب تک اور غالب سے لے کر حالی تک کے کلام اور عہد بہ عہد کے نثر نگاروں کی تمام نزاکتوں سے واقف تھے۔ فارسی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ فارسی شعراء کے دواوین کی چھان پھٹک کر چکے تھے.... ادبیات کا مطالعہ وسیع و عمیق تھا"[4]

وہ جب کسی ادبی موضوع پر گفتگو کرتے تو اُس میں تیقّن، وزن اور وقار بدرجۂ اتم موجود ہوتا۔ ادبی و شعری تذکروں کی برجستہ گوئیاں اُن کے نوکِ زبان تھیں۔ اور اُن کو سیاسی واقعات و سانحات پر پھبتیاں کرنے میں بے مثل تھے۔

شاعری کامل یکسوئی کی متقاضی ہے اور یہی شے حسرت کی زندگی میں مفقود رہی۔ وہ زندگی بھر کوئی کام بھی یکسوئی اور توجہ سے نہ کر سکے۔ البتہ اس امر کی آرزو ہمیشہ اُن کے دل میں رہی۔ جو کچھ کیا آج کے لئے کیا کل اُن کے پیشِ نظر کم ہی رہا*۔ جیسے عربی میں کہا جاتا ہے "الیوم خمرٌ و غداً امرٌ" آج کا دن جام کے لئے ہے اور کل کا دن ایک بڑے کام کے لئے۔ اور اُن کا کل کبھی نہ آیا۔ وہ آج کی خوشیوں سے آج ہی متمتع ہونا چاہتے تھے،

---

* "... اُن کی زندگی لمحہ بہ لمحہ، ساعت بہ ساعت، روز بروز کی زندگی تھی۔ کوئی پلان، کوئی منصوبہ انہوں نے کبھی نہیں بنایا۔ وہ دور اندیش آدمی نہیں تھے۔ وہ زندگی بسر کی جسے LIVING FROM MOMENT TO MOMENT کہتے ہیں" (علامت، لاہور، فروری ۱۹۹۰ء ص ۱۲)

غموں کو بھلائے رکھنا اُن کی عادت تھی۔ دن کو وہ ایک عالم منودگی سے نبرد آزما رہتے اور رات کو تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ بیدار ہو جاتے اور کیفیت یہ ہوتی کہ ہم سینے والے مسافر دنیا سے گزر گئے۔ "آپ چراغ کی تابناکی دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے رات کے اندھیارے میں دیکھئے دن کے اجالے میں نہیں؟"

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم رقمطراز ہیں "ان کی نظر زندگی کے روشن پہلو پر پڑتی ہے زمانے کی تلخیوں کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اپنی کٹھن زندگی سے صرف خوش گوار یادوں کو سمیٹنا، ان سے قلبی راحت حاصل کرنا اور دوسروں کو مسرت پہنچانا اُن کا شیوہ تھا۔ حافظ کی طرح دنیا اور دنیا والوں کی محبوبیاں انہیں یاد تھیں اور انہیں کو دیکھ کر خود زندہ رہنے کا گُر سکھاتے تھے۔"[6]

ایک اچھا ادیب اور ایک اچھا شاعر ہونے کے لیئے ایک اچھی شخصیت کا ہونا ضروری ہے۔ صحافت، مزاح نگاری اور شاعرانہ کمالات کے علاوہ اُن کی شخصیت بھی عظیم تھی۔ اُن کی شخصیت میں رسمیت کو بہت کم دخل تھا۔ نخوت، رعونت، اور عبوست نام کو نہ تھی۔ بڑے بڑے لوگوں سے ان کے مراسم رہے لیکن اُن پر بھی طنز کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ذاتی مراسم کو صحافتی ذمہ داریوں کے درمیان حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس جرأت رندانہ نے انہیں دنیا کی ابلہ فریبیوں سے بچائے رکھا۔ وہ خود نہایت صاف گو تھے اس لیئے دوسروں سے بھی اسی بات کی توقع رکھتے تھے۔ کرشن چندر لکھتے ہیں کہ "حسرت کی زندگی کا روشن ترین پہلو اُس کی آزادی ہے جس بات کو وہ صحیح سمجھتا ہے اس پر عمل پیرا ہوتا ہے، اپنی صحافتی زندگی میں میرا خیال ہے اُس نے ایک بار بھی اپنے ضمیر کو دبانے کی کوشش نہیں کی۔"[7] ان کی صاف اور سجل شخصیت کا جمال اُن کے فن پاروں میں بھی اُتر آیا ہے۔

جن لوگوں نے حسرت کو قریب سے دیکھا ہے اور عرصۂ دراز تک اُن کے ساتھ رہے ہیں وہ سب اُن کی شخصی خوبیوں کے معترف و مداح ہیں۔ منٹگمری میں اُن کے ساتھی اور شب و روز کے رازدان جاوید خشک لکھتے ہیں:

"ہم سب ساتھیوں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا۔ دنیا انہیں ایک بڑے صحافی مزاح نگار، تاریخ دان اور شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لیکن ہم نے انہیں ایک مکمل انسان، مہربان دوست، شاندار لیڈر، اور کامیاب استاد بھی پایا۔

اُن کے سینے میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا تھا۔ اُن سے کسی بھی مجبور انسان کا ذہنی اور جسمانی دُکھ نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ غریبوں اور مصیبت زدوں کی دامے، درمے، سخنے مدد کرتے رہتے تھے۔"

چراغ حسن حسرت کی دوست نوازی کے بارے میں حسن عسکری صاحب کے خط کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں کہ "اس لحاظ سے امروز مجھے سب سے اچھا لگتا ہے، مگر چراغ حسن حسرت صاحب اپنے دوستوں یعنی تاثیر، بخاری صاحب کے خلاف ایک بات چھاپنا گوارا نہیں کرتے۔"

اُن کی شخصیت کا ایک اور رُخ جو دوست نوازی اور وضع داری کے علاوہ تھا وہ یہ ہے کہ حسرت صحیح معنوں میں آزاد خیال تھے۔ وہ رجعت پسند ہرگز نہ تھے۔ اُن کو شخصی آزادی بہت عزیز تھی۔ معاشرے میں بے جا پابندیوں اور بے معنی رسوم کے مخالف تھے۔ مگر مشرقی اقدار اور روایات کی ہمیشہ قدر کرتے تھے۔

حسرت نے اپنی زندگی کو بھی کبھی کسی بندش یا پابندی کا خوگر نہیں ہونے دیا۔ "آزادگی" اُن کا شیوہ تھا۔ حتیٰ کہ حلقۂ ازدواج میں بھی بہت دیر سے آئے۔ جب فوج میں گئے تو وہاں کے سخت قواعد بھی اُن میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ کر سکے۔ کلکتہ و سنگاپور کا "تقویٰ شکن" ماحول حسرت کو بیکوں سے دیتا رہا اور اُس کی لہروں پر ڈوبتے، ابھرتے اور بہتے رہے۔ حسرت کی آزاد منشی کے بارے میں اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

"حسرت صاحب کی آزاد منشی، شوخیٔ طبع، اور طنز و مزاح کی استادی کا سب نے اقرار کیا ہے۔ میں نے کلکتہ سے کراچی تک انہیں ایک ہی رنگ میں دیکھا۔ اُن کا مقولہ تھا کہ ماحول بُرا ہو تو لاحول پڑھو اور اُس کا مظاہرہ یوں کرتے کہ جب کوئی بُری خبر آتی تو سگرٹ کا گہرا کش کھینچ کر اُس کی راکھ جھاڑ دیتے گویا دامن سے غم جھٹک دیا ہو۔"

حسرت کی شخصیت کے اِن پہلوؤں کی جھلک اُن کی تحریروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

چراغ حسن حسرت جذباتی آدمی تھے جذبات کی رو میں بہہ کر کہیں سے کہیں نکل جاتے۔ دو سال کے بعد جب

سنگاپور سے روانہ ہوئے تو وہاں کی محفلیں، رنگ و نور کی کیفیتیں، بادہ و ساغر کی سرمستیاں اور ہاؤ ہو کی یہ مجلسیں سب اُن کے دامن کو کھینچ رہی تھیں اور دل پر نقش تھیں۔ اپنے دوست کرنل مسعود کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ سے رخصت ہوتے وقت بغل گیر ہونے اور وہ باتیں کہنے کا موقع نہیں مل سکا جو میرے قلب میں کھٹک رہی تھیں۔ تاہم ایک لحاظ سے یہ بھی اچھا ہوا کیوں کہ میں ذرا جذباتی آدمی ہوں ممکن ہے کہ اس موقع پر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور وہی کیفیت ہوتی جس کا نقشہ حالی نے کھینچا ہے۔

؎ نہیں بھولتا تری رخصت کا وقت   وہ مل مل کے رونا بلا ہو گیا٭"

چراغ حسن حسرت نے یہاں جس جذباتیت کا ذکر کیا ہے وہ اُن پر اکثر و بیشتر حاوی رہی اور جس نے کبھی ٹھیک کر کام کرنے یا سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ ورنہ وہ شعر و شاعری کے رموز سے جس حد تک آگاہ تھے اُن کے ہم عصروں میں بہت کم اس مقام پر فائز تھے۔ ایک گونہ بے خودی دن رات اُن پر طاری رہی۔ سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ:

"اُن کی مشہور غزل "آؤ حسن یار کی باتیں کریں (سنگاپور میں) ہمارا قومی ترانہ تھی جس کے بعد مرشد حسنِ یار کی باتوں سے آگے نکل کر خود راستہ یار کی طرف چل نکلتے۔"

یہاں بھی اُن کی بے خودی اور جذباتیت کی طرف اشارا ہے۔

چراغ حسن حسرت کا جتنا بھی کلام فراہم ہوا ہے وہ اگرچہ ضخامت میں کم ہے لیکن اہمیت میں اپنے زمانے کے کسی بھی شاعر سے کم نہیں۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ فن شاعری میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، شاعری کی نزاکتوں سے کماحقہ آگاہ تھے اور جو کچھ لکھا وہ ناپ تول کر لکھا، دوسرا بچپن سے ہی اُن کو جو ماحول ملا اُس سے اُن کی سوچ اور فکر میں پختگی آ گئی تھی۔ وہ وسیع المطالعہ شخص تھے اُن کو "دائرۃ المعارف" بے جا نہیں کہا گیا۔ اس طرح علم کے مختلف النوع

٭ خط بنام کرنل مسعود۔ تاریخ درج نہیں قرائن کہتے ہیں کہ فروری ۱۹۴۷ء میں لکھا گیا ہو گا۔

میدانوں سے شناسائی نے بھی اُن کے قلم میں استادانہ شان پیدا کردی تھی۔ غزلوں کی تعداد بیس اکیس کے قریب ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اِن محدود غزلوں میں چند غزلیں اُردو غزل کے سرمائے میں مستقل جگہ بنا گئی ہیں۔ کچھ غزلوں کے مصرعے زبانِ زدِ عام ہو کر شہرت حاصل کر گئے ہیں۔ جدید اردو غزل کی تاریخ میں چراغ حسن حسرت کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے خود آجاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

"انہوں نے بہت کم تعداد میں غزلیں کہی ہیں اس کے باوجود اُن کے بعض مصرعوں کا ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ قادر الکلام تھے اور غزل کی کلاسیکی روایت اُن کے ہاں رچی ہوئی تھی بصورتِ دیگر یہ کیسے ممکن ہے کہ چند غزلوں کے شاعر کے چند اشعار اور مصرعے ہمارے حافظے کا سرمایہ بن جائیں"*

حسرت کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے ندیم صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"پھر اُن کی شاعری میں سلاست ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے اُن کے بیشتر معاصرین محروم تھے۔ یہ سلاست نری آسان زبان نہیں تھی بلکہ اس میں بے ساختگی کا عنصر بدرجۂ اتم شامل تھا اور بے ساختگی ہمیشہ سلیس ہوتی ہے"۵

فنِ شاعری پر چراغ حسن حسرت جس طرح گہری نظر رکھتے تھے اور اُن کے معاصرین اُن کو جس طرح سند الوقت خیال کرتے تھے اُس کا اندازہ فیض احمد فیض کے خط کے اس اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"میں نے لغویات کا ایک نیا مجموعہ 'دستِ صبا' کے نام سے چھپنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ افسوس کہ آپ لاہور میں نہیں ورنہ میں چاہتا تھا کہ آپ ایک نظر دیکھ لیتے۔ چار پانچ سال انگریزی اخبار میں سر مارنے سے جو تھوڑی بہت اُردو آتی تھی وہ بھی بھول گئی ہے۔ اس لئے اِن منظومات میں ضرور بہت سی قباحتیں رہ گئی ہیں۔ آپ دیکھ لیتے تو کچھ صاف ہو جاتیں"؟!

---

* احمد ندیم قاسمی کا خط راقم الحروف کے نام محررہ ۲۹ اپریل ۱۹۹۰ء

۵ ایضاً

مذکورہ بالا اقتباس میں فیض کا حسرت کے بارے میں رویہ ایسا ہے جیسے ایک شاگرد کا استاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ حالانکہ حسرت اور فیض کی عمر میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ فیض، حسرت سے چھ سات سال چھوٹے تھے۔
خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کی فن کے تسامحات پر نظر کتنی گہری تھی۔ 'حرف و حکایت' میں کئی مقامات پر مختلف شعراء کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اُن کی ژرف نگاہی پر دال ہے۔
حسرت ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"راقم الحروف نے ایک مرتبہ ایک نوجوان شاعر کا کلام سُن کے بعض غلطیوں کی طرف اشارا کیا اور کہا کہ اگر یہ نقائص نہ ہوتے تو نظم کا حُسن دوبالا ہو جاتا۔ انہوں نے یہ سُن کے کسی قدر ناگواری سے فرمایا "لیکن میں اِن غلطیوں کو غلطیاں نہیں سمجھتا"۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ اگر آپ نے دیدہ و دانستہ یہ غلطیاں کی ہیں تو آپ کے مجتہد ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن اگر آپ کو آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے کلام میں یہ نقائص موجود ہیں تو یہ اجتہاد نہیں بے خبری ہے[13]"

فارسی شاعری میں حسرت رودکی سے اقبال تک ہر بڑے شاعر کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اور اُن کا کلام اُن کے حافظے میں محفوظ تھا تو نوآموز شاعروں اور ادیبوں کو ہمیشہ یہی مشورہ دیتے کہ:

"بے تحاشہ قلم اُٹھانے سے پہلے مطالعہ وسیع کرو تاکہ ادب کے تنوع اور اُس کی بوقلمونی سے زبان و بیان کے چھپے ہوئے گوشے بے نقاب ہوتے چلے جائیں[14]"

چراغ حسن حسرت روایت پسند انسان تھے اور یہ روایت پسندی اُن کی تخلیقات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ نئے تجربوں کو خواہ وہ زندگی میں ہوں یا شاعری میں زیادہ پسند نہیں کرتے تھے:

"حسرت مرحوم کو اردو ادب کے کلاسیکی حصّے سے گہرا شغف تھا اور وہ اپنے ہر ملنے والے کو بہ اصرار اردو کی داستانوں کے مطالعے کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک ہم اپنے پرانے ادب کے قابلِ قدر حصّے کا مطالعہ نہیں کریں گے ادبی روایات کے تسلسل کو سمجھنا مشکل ہے[15]"

حسرت نے کئی مواقع پر اُن سر خود غلط ادیبوں کا مذاق بھی اُڑایا ہے جو ادب و شعر کی مبادیات

جانے بغیر طبع آزمائی شروع کر دیتے ہیں۔ 'مطائبات' میں کئی مقامات پر موصوف نے ایسے ہی شاعروں
کو نشانۂ کالم و قلم بنایا ہے۔ شاد عظیم آبادی کی غزل پر مُلّا رموزی نے کچھ اعتراضات کیے تھے، حسرت نے اُن
کا بڑا مسکت جواب دیا ہے، جو اُن کے تنقیدی شعور کی دلچسپ اور خوب صورت مثال ہے۔ اس تنقیدی
رد میں مُلّا کی ایک نظم کا بھی جائزہ لیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے اور جس سے حسرت کی طبیعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

"'مدینہ' میں مُلّا صاحب کی ایک نظم 'ملالت' کے عنوان سے چھپی ہے اس کے بعض اشعار ملاحظہ فرمائیے:

؎ نزاکت کو صحیح معنوں میں بھی اک بار دیکھا ہے۔ کہ اک پھولوں کے بستر پر تجھے بیمار دیکھا ہے

دیکھا بھوپال کے پہلوان سخن نے صحیح کی حالتِ خطّی کو کس زور سے پٹخنی دی کہ فردوسی بیچارا
قبر میں کانپ اُٹھا۔ باقی رہ شعر کا مضمون تو وہ رموزی کے رموز میں سے ہے جس نے
جرأت کو اس قسم کے شعر پر یوں داد دی تھی کہ "تم شعر کہنا کیا جانو۔ اپنا چوما چاٹا کہہ لیا کرو"
پھر ارشاد ہوا:

؎ اک ہلکے ہلکے اور دھیمے سے دردِ سر کی الجھن ہے۔ تری آنکھوں میں لرزاں جادوئے سرشار دیکھا ہے۔

وہاں حالتِ خطّی پر آفت آئی یہاں ہائے ہوّز پر مُلّا کی مار پڑی۔ سچ پوچھو تو یہ اس طرح
وزن سے نکلی ہے جس طرح مُلّا کے عمامہ میں اڑسی ہوئی مسواک گنبدِ دستار کا
کلس بن گئی ہے۔"[16]

اسی طرح باقی اشعار پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ حسرت کا خاص اسلوبِ بیان ہے جو اُن کی
اکثر نثری تحریروں میں ملتا ہے۔ غزل پر تنقید کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ایسے اہم مبحث پر قلم اٹھانا اُسی شخص کو زیب دیتا ہے جو غزل کے آغاز کی تاریخ،
اس کی عہد بعہد ترقی اُس کے اجزاء و عناصر اور رسمیات سے واقف ہو۔"

سیماب اکبر آبادی نے اپنے رسالہ 'شاعر' میں 'بالِ جبریل' پر سلسلۂ تنقید شروع کیا تھا۔
حسرت نے اپنے کالموں میں جس انداز سے اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے اُن سے اُن کی شاعری
پر فنی دسترس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

چراغ حسن حسرت کلاسیکی ذوق اور روایات کے دلدادہ شخص تھے۔ نئی تحریکوں اور

نئے تجربوں کو بنظرِ استحسان کم ہی دیکھنے کے لئے تیار ہوتے تھے۔ ہمارے ہاں "آزاد نظم" کے تجربے شروع
ہوئے تو اُن کی روایت پسندی کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انہوں نے اُن کا مذاق اُڑانے کے لئے پے در پے
کئی نظمیں لکھ دیں، اور اس قسم کی ترقی پسندی کا بھرپور خاکہ اُڑایا۔ وہ وضعدار شخصیت کے حامل تھے
یہی وضعداری انہوں نے آخری لمحات تک برقرار رکھی۔ اُن کی شاعری میں بھی روایت پسندی و وضعداری
کی واضح جھلکی دکھائی دیتی ہیں۔ مولانا عبد المجید سالک لکھتے ہیں:

"وہ جدید شاعری کے مخالف تھے۔ چنانچہ اس کے متعلق اُن کی پیروڈیاں مشہور ہیں۔
'امروز' میں تین سال ایڈیٹری کے باوجود وہ کمیونزم، ترقی پسند ادب، اور
دوسرے جدید رجحانات کو سو فی صدی اپنا نہ سکے بلکہ اپنے خیالات و عقائد
پر پختگی سے قائم رہے۔ یہاں تک کہ جب 'اوپن ائرتھیٹر' میں جنگجو ترقی پسندوں
کی کانفرنس حسرت کی صدارت میں منعقد ہوئی، جب بھی خطبۂ صدارت میں
انہوں نے اپنی انفرادیت اور قدامت پسندی کا صاف اعلان کر دیا۔"[18]

حسرت اس قسم کی جدیدیت اور ترقی پسندی کے خلاف تھے جس میں جان بوجھ کر ایسے الفاظ،
تراکیب یا خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا جو ہماری ادبی روایت سے کٹے ہوئے تھے یا فقط قارئین کے
"کان کھڑے" کرنے کے لئے، کوئی نعرہ زنی یا ذہنی اپج کا ثبوت دینے کے لئے نئے تجربے کیے جاتے تھے۔
حسرت کی عام گفتگو بھی کالم میں ہی ہوتی تھی۔ کسی نے بیٹھے بیٹھے کسی بڑے ادیب کے بارے رائے پوچھ لی
تو فرمایا "یکے از فرومایگانِ ادب"۔ ایک نامنہاد ترقی پسند نوجوان شاعر کے بارے فرمایا، جس نے اپنی
نظم میں ناگاساکی، ہیروشیما اور ایٹم بم کے الفاظ باندھے تھے کہا، "یہ آپ شاعری کرتے ہیں یا لوگوں کو ڈراتے ہیں"[19]
یہ تھا اُن کا مزاج، تنقیدی نظر، اور ادبی رویہ جو اُن کی تمام تخلیقات میں دیکھا جاسکتا ہے۔

چراغ حسن حسرت کی طبیعت کم آمیزی کی طرف مائل تھی۔ دوسروں کے شعر
سن کر خوش ہوتے رہتے اپنے اشعار سنانے میں اُن کو تامل تھا۔ بے تکلف دوستوں میں کھل
جاتے تھے، لیکن نوواردوں میں خاموشی کو ترجیح دیتے۔ کم آمیزی اور دھیماپن اُن کی غزلوں میں
دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ مطالعے کے شوقین و شیفتہ تھے بقول سید ضمیر جعفری "چراغ حسن حسرت کی

زندگی تین چیزوں سے مرکب تھی اور وہ تین چیزیں تھیں سگرٹ، کتاب اور شراب" - زندگی بھر یہی خواہش رہی کہ دریا کا کنارہ ہو، اچھا سا گھر ہو اور گھر میں ضرورت کی کتابیں اور سکون سے بیٹھ کر 'بغداد و سمرا' کی تاریخ لکھتے رہیں۲۔ لیکن افسوس اُن کی زندگی شعلۂ مستعجل ثابت ہوئی۔ بہت جلد بھڑک کر خاموش ہو گئے۔

زندگی کے آخری سات آٹھ سال جو انہوں نے لاہور اور کراچی میں بسر کیے وہ زیادہ تر بیماری اور سہل انگاری کی نذر ہو گئے۳ اس لیے کسی ضابطے اور ڈھنگ سے کام نہ کر سکے۔ دخترِ رز نے عارضۂ قلب میں مبتلا کر دیا، صحت برباد ہو گئی اور سارے مسودے دلِ ناداں کے رہ گئے۔ وفات سے چند روز پہلے میر انیس کا یہ شعر زبان پر تھا جو اُن کے احوال کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

؎ اعضائے بدن سب چور ہوئے اک دل کے شہادت پانے سے
فوجوں میں تلاطم برپا ہے، سالار کے مارے جانے سے

چراغ حسن حسرت بلاشبہ ادب کے بہت سے شعبوں میں سالار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر حسرت دورِ سرسید میں ہوتے تو اردو کے عناصرِ خمسہ میں ایک اور نگیں کا اضافہ ہو جاتا۔ نثر نگاری میں اُن کے معاصرین میں اُن کا کوئی مثیل نہ تھا، سب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ کالم نگاری میں انہوں نے جس روش کو متعارف کرایا، آج تک اُس کی پیروی کی جا رہی ہے۔ اُن کی شخصی انفرادیت نے اُن کی خامہ فرسائیوں کو بھی قابلِ تقلید انفرادیت عطا کر دی تھی۔ شاعرانہ کلام اگرچہ مقدار میں کم تھا لیکن نیرنگی و لطافت میں بہتوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ حسرت اول و آخر شاعر تھے اُن کی نثر بھی شعریت کا جمال رکھتی ہے۔ جگہ جگہ اشعار کا استعمال اس بات پر دال ہے کہ شعر کس طرح اُن کی گھٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ اپنے کالموں میں اکثر مقامات پر اردو شاعری کے پس منظر میں بات کی ہے، حتیٰ کہ انہوں نے 'مردم دیدہ' کے مضامین میں جو باریک بینی، فطرت شناسی اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے مطالب ادا کیے ہیں، یہ سب غزل کا سا انداز اور اُسی کی دین ہے۔ غزل میں بڑی بڑی باتوں کو دو مصرعوں میں مقید کرنے کا جو کمال موجود ہے اُس کو حسرت نے نثر میں بھی بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ اور ایسا وہی شخص کر سکتا ہے

جو شاعری کی نئی نزاکتوں سے آگاہ ہو۔ اور فارسی اردو کی پوری تاریخ اور مزاج سے واقف ہو آشنا ہو۔

شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

"وہ عروض میں بہرۂ وافر رکھتے تھے، شاعری کے سرکوچہ سے آشنا رہے لیکن اپنے آپ کو شاعری کے حوالے نہیں کیا۔ کبھی کبھار شعر کہہ کر جی کو بہلا لیتے تھے۔ غزل ہو یا نظم، طنز کریں یا پیروڈی، نعت لکھیں یا منقبت قلم اُن کا موتی بکھیرتا تھا۔ اُن کا شاعرانہ کلام بہت ہی مختصر ہے لیکن جو لکھا ہے ناپ تول کر لکھا ہے اور دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔"[۲۱]

چراغ حسن حسرت کی ادبی شخصیت، شاعرانہ مزاج، اور تنقیدی بصیرت کے اجمالی جائزے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مختلف تحریروں، تقریروں اور گفتگوؤں کے حوالے سے اُن کے ادبی نظریات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ کسی ادیب کی پسند و ناپسند کا سراغ اُس کی تخلیقات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اُس کے رویے اور اُن رویوں کا اُن کی تحریروں میں بطور بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ حسرت کی تمام تحریریں بغور دیکھی جائیں تو ہمیں کہیں بھی زہرناکی یا دلآزاری نہیں ملے گی۔ ہر مقام پر انہوں نے اپنے لہجے کی آبرو کو قائم رکھا ہے۔ اپنے سے چھوٹوں کے سامنے کبھی معیار سے گری ہوئی بات یا حرکت پسند نہیں کرتے تھے۔ جاوید خٹک° بیان کرتے ہیں کہ مجھے شاعری کا شوق چرایا تو میں نے چند غزلیں بغرضِ اصلاح حسرت صاحب کو دکھائیں سرسری طور پر غزلیں دیکھ کر لوٹا دیں۔ وہ میں امید و بیم کی حالت میں سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا مولانا تھوڑی دیر تک گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتے رہے پھر فرمانے لگے "صاحبزادے سچ سننے کی تاب رکھتے ہو یا نہیں؟ جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو فرمانے لگے، میری دانست میں تم کبھی اچھے شاعر نہیں بن سکتے، ویسے تک بندی کرنا چاہو تو اور بات ہے۔ میرا کہا مانو اور شاعری کی جانِ ناتواں پر مزید کرم فرمائی کا خیال چھوڑ دو۔" مولانا کے ایک ساتھی

° جاوید خٹک ضلع مردان سفید ڈھیری کے رہنے والے بڑے وجیہ نوجوان تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں فوج کے محکمہ تعلقاتِ عامہ سے منسلک رہے۔ بسنگاپور میں حسرت کے ساتھ 'جوان' کے عملۂ ادارت میں رہے۔ ۱۹۸۸ء میں انتقال ہوا۔

جو اب تک خاموش کھڑے تھے بول اٹھے " مولانا یہ صاحبزادے تو خود مجسم شعریت ہیں پھر یہ خود شاعر کیوں
نہیں بن سکتے۔" مولانا کے پرسکون چہرے پر برہمی کے آثار ظاہر ہوئے وہ سخت غصے کی حالت میں اپنے
دوست سے مخاطب ہوئے۔ "مولانا آپ اپنی اس کج روی سے کبھی باز آئیں گے یا نہیں، آپ کو ہزار بار
سمجھا چکا ہوں کہ بچوں کے سامنے ایسی باتیں کرنا معیوب ہے۔ لیکن آپ کے سر پر آسکر وائیلڈ کا
جو بھوت سوار ہے وہ آسانی سے اترتا نظر نہیں آتا۔" صحت مند ادب تخلیق کیجیے مولانا! جو قوم کی
ذہنی نشوونما کر سکے ہمارے فن کاروں کو ایسے مبتذل جذبات زیب نہیں دیتے۔"[22]

اس طویل اقتباس میں حسرت کے ادبی نظریے کے علاوہ ان کی شخصیت کے ایک خوش گوار
پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ بچوں یا چھوٹوں کے سامنے معیار سے گری ہوئی کوئی بات نہ کی جائے۔
جس کا عام طور پر خیال نہیں رکھا جاتا۔

عام طور پر شعراء کے بارے میں حسرت کی رائے اچھی نہیں تھی۔ وہ شاعری کو بے کاروں
کا مشغلہ سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں نوجوانوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ البتہ جن لوگوں میں شاعری
کا ملکہ فطری طور پر موجود ہوتا ان کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

چراغ حسن حسرت فارسی اور اردو کے کلاسیکی سرمائے سے گہرا شغف رکھتے تھے اور
دوسروں کو بھی اس کے مطالعے کی نصیحت اور ترغیب دیتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق:

" جب تک ہم پرانے ادب کے قابلِ قدر حصے کا مطالعہ نہیں کریں گے ادبی
روایات کے تسلسل کو سمجھنا مشکل ہوگا۔"[23]

ادب کے بارے حسرت کا یہ نظریہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ ادبی روایات کے تسلسل کو سمجھنے کے لئے
کسی بھی ادیب کے لئے قدیم ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ جب تک وہ ماضی کی روایات سے واقف و
آشنا نہیں ہوگا، تب تک تاریخی اور ذاتی مغالطوں کے علاوہ کئی بنیادی غلطیوں میں پھنسا رہے گا۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے قول کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

" وہ ماضی کو ادب و تہذیب کے لئے بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اور اس بات پر
زور دیتا ہے کہ اپنے دور کا شعور بغیر ماضی کے شعور کے ادھورا اور ناقص ہے۔

بلکہ ماضی حال کا حقیقی حصہ ہے[۲۴]"

ٹی. ایس. ایلیٹ نے اپنے دور کے شعور کے ساتھ، ماضی کے شعور کا جو ذکر کیا ہے وہ شاعروں کے سلسلے میں ہی کیا ہے۔

۱۹۳۷ء میں چراغ حسن حسرت ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ جلیانوالہ باغ امرتسر میں شریک ہوئے انہوں نے جب کانفرنس میں دیکھا کہ ترقی پسند سیاست کے ہنگامے تو بہت ہیں لیکن ادب کا سراغ نہیں تو وہ بے زاری کا اظہار کر کے وہاں سے اٹھ آئے۔

نومبر ۱۹۴۹ء کو اوپن ائیر تھیٹر لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں چراغ حسن حسرت نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے نظریات و خیالات کا اظہار کیا۔ خطبے کے اولین جملوں ہی سے اُن کی روایت پسند سوچ کا اظہار ہوتا ہے:

"ہم آج ایک ایسے شہر میں جمع ہیں جو اپنی قومی، تہذیبی اور ادبی روایتوں کے لحاظ سے پاکستان بھر میں یگانہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے[۲۵]"

خطبۂ استقبالیہ میں انہوں نے لاہور کی علمی و ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ فارسی زبان و ادب کا ذکر کیا، مغلوں کے عہد میں علمی و ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اِن تفاصیل کے بعد بیان کرتے ہیں کہ:

"ہم اپنے اسلاف کے کارناموں سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتے ہمارے لئے اُن کے تبرکات سے قطع نظر کرنا ناممکن ہے کہ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا کارواں جن منزلوں سے گزرا ہے انہیں فراموش کر دیا جائے۔ ماضی اس لئے بھی تو اہم ہے کہ ہمارے امروز و فردا یعنی ہمارے حال و مستقبل کی تخلیق میں اس کا بڑا حصہ ہے[۲۶]"

چراغ حسن حسرت کے اِن خیالات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ماضی و حال کے رشتوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، اور ادب میں اس چیز کا احساس و شعور کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ صرف ماضی پرستی کے قائل نہیں ہیں بلکہ ماضی کی روشنی سے مستقبل کو تابناک بنانے پر بھی زور دیتے ہیں۔

حسرت نے لاہور میں جدید شاعری کی کونپل کے پھوٹنے کا ذکر اور اُس کے ساتھ حالی، آزاد

اور ارشد کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اقبالؒ، ظفر علی خاں، سر عبدالقادر کی خدمات کا حوالہ دینے کے بعد لیطرس کی نثر نگاری اور صوفی تبسم کی فارسی غزل اور اُس کا تغزل کی روایتوں پر قابلِ قدر حصے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اختر شیرانی اور فیض احمد فیض کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان تفاصیل میں حسرت کے اپنے ادبی نظریات بھی پوشیدہ ہیں، کہ وہ کن ادباء کو کن وجوہات کی بنا پر ادب میں ایک خاص مقام پر فائز کر رہے ہیں، اور یہ ادیب کس طرح بعد کی ادبی تحریکوں اور ارتقاء میں ایک تسلسل اور ایک روایت کی علامت بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر ترقی پسندی کی تحریک شروع شروع میں اپنا کوئی مفہوم متعین نہ کر سکی۔ حسرت نے اس سلسلے میں کچھ مشورے بھی دیئے ہیں جو حقیقت میں اُن کے ادبی نظریات ہی ہیں۔

چراغ حسن حسرت کے ادب کے بارے میں نظریات چونکہ اس شرح و بسط کے ساتھ کبھی سامنے نہیں آئے، جس طرح خطبۂ استقبالیہ میں آئے ہیں تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقتباسات درج کر دیئے جائیں تاکہ انہی کے الفاظ میں اُن کے خیالات سے آگاہی ہو سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... اس انجمن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو صرف الفاظ کے چنگیزی مینار کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ لوگ بھی ترقی پسند ہی سمجھے جاتے تھے، جنہیں معلوم نہیں تھا کہ شعر و ادب کی حدود و قیود کیا ہیں، لیکن وہ انہیں توڑنے پر اپنے آپ کو آمادہ پاتے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اُن کے اسلاف نے اُن کے لئے کس قسم کا ورثہ چھوڑا ہے، لیکن وہ اپنے ماضی سے بیزار تھے اُن کے نزدیک ترقی پسندی یہی تھی کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو لوگوں کو چونکا دے۔ اُن کے افسانوں اور نظموں کا موضوع ادنیٰ قسم کی لذت پرستی تھی۔ وہ جنسی بے راہ روی اور بے قیدی ہی کو ترقی پسندی کے سمندر کی سب سے اونچی موج سمجھتے تھے۔"[۲۴]

حسرت نے ترقی پسند ادب کے ابتدائی منفی رجحانات کے ذکر کے بعد بیان کیا ہے کہ وہ دور گزر گیا اور اس کے بعد ترقی پسندی کے خدوخال واضح صورت میں سامنے آنے لگے۔ ترقی پسند ادیبوں کو معلوم ہو گیا کہ:

"وہ ماضی کے تجربات سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتے۔ انہیں آگے بڑھنا ہے تو اسلاف کے کارناموں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا ہوگا۔ وہ جانتے ہیں کہ الفاظ کے انبار کھڑے کرنا اور پے در پے بھاری بھاری سیلیں چنتے چلے جانا، مفہوم کو اتنے پردوں میں چھپانا کہ گنے چنے لوگوں کے سوا کسی کی نگاہ اُن تک نہ پہنچ سکے، نہ صحیح ادب ہے نہ صحیح شاعری[۲۸]"

چراغ حسن حسرت نے یہاں جن چیزوں پر زور دیا ہے وہ اُن کی اپنی تحریروں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ماضی کے تجربات و روایات سے تو وہ ہر لمحہ منسلک رہے ہیں۔ الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں وہ بہت زیادہ محتاط تھے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم کا ادا کر جانا اُن کے ادبی کمالات میں سے ہے۔ پھر سادگی اور سلاست خواہ نثر ہیں ہو یا نظم میں حسرت کا طرۂ امتیاز ہے۔ شورش کاشمیری نے درست لکھا ہے کہ وہ شاعری اور نثر دونوں کے ناخن تھے:

"اس باب میں شاید ہی کوئی دوسرا اُن کا حریف ہو۔ وہ الفاظ کی نسلوں تک سے آشنا تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ فلاں محاورہ کہاں سے آیا؟ فلاں روزمرّہ کی اصلیت کیا ہے؟ اس ضرب المثل کی بنیاد کس نے رکھی؟ یہ کہاوت کیوں کر بنی؟ فلاں ادیب کا سرمایۂ الفاظ کتنا ہے؟ فلاں شاعر کے ہاں کل کتنے الفاظ ہیں؟ عروض میں یگانہ، اسناد میں منفرد[۲۹]"

جب کہ حسرت خود زبان و بیان میں یگانہ اور منفرد تھے تو کس طرح ترقی پسند ادیبوں کی ادبی و لسانی، اور فکری و نظری بے راہ روی کو پسند کر سکتے تھے۔ انہوں نے ببانگ دہل اپنے خیالات کا اظہار کیا اُن گمراہیوں کی طرف واضح اشارے کیے جو کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز میں کچھ نام نہاد ادیبوں نے روا رکھیں۔

وہ ادب میں وضاحت و صراحت کے قائل تھے۔ اور کسی گروہ کی اجارہ داری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ادب کو افادیت کی چیز سمجھتے تھے ادب برائے ادب کے نظریے سے متفق نہیں تھے۔ اور مخصوص قسم کے سانچوں اور ٹھپّوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ ادب میں جمالِ صداقت کا پرچار کرنے والے تھے۔ حسرت لکھتے ہیں:

"آج آپ لوگوں کو دیکھنا چاہیئے کہ ادب اور شاعری خواص کا کھلونا بن کر نہ رہ جائیں۔ آرٹ پر ایک طبقہ قبضہ کر کے نہ بیٹھ جائے۔ رمزوں اور اشاروں میں باتیں کہنے کے بجائے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کیا جائے لیکن اس میں بھی شاعرانہ اور ادیبانہ سلیقہ ضرور ہو تاکہ وہ ایک بے ڈھنگم سی صدا نہ بن کر رہ جائے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کی افادیت کا دائرہ اتنا وسیع ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ ترقی پسندوں کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ افادیت کے اس دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے ادب اور شاعری کا عوامی ہونا ضروری ہے۔ عوامی کے یہ معنی نہیں کہ وہ صرف عوام کے متعلق ہو بلکہ اس کے لئے عوام کی زبان سے بھی اعتنا کرنا پڑے گا۔ افسوس کہ آج تک دیہاتی گیتوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ دیہات کے لوگ زندگی کے دھارے کے زیادہ قریب کھڑے ہیں۔ اُن کے گیت اُن کی زندگی کے ترجمان ہیں۔ ان کی آرزوئیں، اُن کے ولولوں، اور اُن کے دلوں کے سوز و تپش، اُن کے دکھوں اور اُن کی مصیبتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔"[۳۰]

وہ ادب اور شاعری کو صحیح معنوں میں عوامی بنانا چاہتے تھے، ایسا عوامی ادب جس میں عوام کی زبان سے سروکار رکھا گیا ہو۔ وہ آرٹ معراج کمال صداقت اور توانائی کو تصور کرتے تھے۔ حسرت کو اس بات کا بھی قوی شعور تھا کہ صداقت کے اظہار کے لئے بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ حسرت کے خیال میں ادب و شعر کے اندر وہ قوت ہوتی ہے جو زندگی کے دھارے کو بدل دیتی ہے، اُس میں سست روی کا سبب بھی بنتی ہے اور منزل آشنا بھی کر دیتی ہے۔ حسرت نے خطبہ استقبالیہ کے آخر میں بیان کیا ہے کہ "وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ کے نغموں میں زیادہ بلند آہنگی اور سرمستی پیدا ہو جائے۔ تاکہ کارواں زیادہ تیزی سے سفر کر سکے۔" اور پھر عرفی کا شعر درج کرتے ہیں:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کمیابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

چراغ حسن حسرت کے کہاں ادب کے افادی پہلوؤں پر جو رائے زنی کی گئی ہے اور ادب کی مثبت

قوتوں کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اُن کو پڑھ کر فراق کا شعر ذہن میں ابھرتا ہے۔

؎ اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

دنیا کو بدلنے اور بہتر بنانے میں ادیب کا بھی نمایاں حصّہ ہے۔ آدمی کا دنیا کو بدلنا یہی ہے کہ ادیب کس طرح مثبت اور تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کر کے زندگی کے قافلوں کی سست گامی کو تیز روی سے بدلتا ہے۔

چراغ حسن حسرتؔ مغرب کے قابلِ قدر ادبی سرمائے سے واقف بھی تھے اور اُس کے دلدادہ بھی۔ انہوں نے مغربی ادب و شعر سے تراجم بھی کیئے۔ نثری تحریروں میں فن کے کمال اور بیزی، ول اسکاٹ، ڈبلیو، ڈبلیو جیکبز وغیرہم کے ترجمے ملتے ہیں۔ جب کہ نظم میں انہوں نے ٹامس مور کی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ٹالسٹائی کے مشہور ناول 'وار اینڈ پیس' کو وہ بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس پسندیدگی کے باوجود وہ مغرب کی اندھی تقلید کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

وہ ہمارے اہلِ وطن مغرب پرستی میں جس انہماک سے کام لے رہے ہیں وہ قابلِ ماتم ہے"[۳۶]

حسرتؔ اس چیز کے خوگر نظر آتے ہیں، جس چیز کی تبلیغ اقبالؒ نے کی ہے کہ:

؎ مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

درج بالا جائزے سے چراغ حسن حسرتؔ کی شخصیت، ذہنی رویوں، شاعرانہ مزاج اور ادبی نظریات پر کسی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں ادب کو کیا اہمیت دیتے تھے۔ ادب اور ادیب، ادیب اور معاشرے کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ زبان و بیان کا ادب میں کیا حصّہ ہوتا ہے۔ اظہار بیان میں سلاست کیا کردار ادا کرتی ہے۔ ادب پر کسی خاص گروہ کی اجارہ داری اُن کے نزدیک ناپسندیدہ قرار پاتی ہے، اور ادب پر مخصوص نظریات و خیالات کی چھاپ اُس کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

وہ صداقت اور توانائی کو آرٹ کی معراج قرار دیتے ہیں۔ حسرتؔ کے نزدیک اسلاف کے کارناموں اور ماضی کے تجربات کے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہے، اک شعور کے

بغیر ادب کے چشمے خشک اور شعروادب کی کھیتیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ اُن کے خیال میں ادیب کی آواز میں اتنی توانائی ہونی چاہیے کہ اُس کی پکار سات سمندر پار پھیل جائے، اور یہ بات تب ہی پیدا ہوگی جب کہ اُس کی تخلیقات میں خلوص اور صداقت کے اجزاء غالب ہوں۔

اشاروں اور کنایوں میں بات کو پیچ در پیچ بنانے کے بجائے صاف انداز اختیار کیا جائے، لیکن اس میں ادیبانہ اور شاعرانہ سلیقہ ضرور ہونا چاہیے۔ ادب بے ڈھنگم صدلوں کا مرکب نہ بن جائے۔ حسرت کے خیال کے مطابق ادب میں ہمیشہ افادیت کا پہلو پیش نظر رہنا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید و سیراب ہو سکیں۔ انہوں نے ادب میں بے راہ روی اور نری جنس پرستی کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

چراغ حسن حسرت اس بات سے کماحقہ آگاہ تھے کہ اسلاف کے کارناموں سے رشتہ توڑنا حال اور مستقبل کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ وہ محض ماضی پرستی کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ماضی کے عمدہ اور اعلیٰ عناصر کو حال و مستقبل کے ساتھ زنجیر کی کڑیوں کی طرح منسلک دیکھنے کے خواہاں تھے۔

حوالہ جات

۱۔ اختر حسین رائے پوری، گرد راہ، کراچی، مکتبۂ افکار، ۱۹۸۴ء ص ۵۴۔

۲۔ چراغ حسن حسرت، حرف و حکایت، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۵۶ء ص ۴۔

۳۔ شورش کاشمیری، نورتن، لاہور، مطبوعات چٹان، ۱۹۶۴ء ص ۶۲۔

۴۔ ایضاً ص ۸۹-۹۰۔

۵۔ ادب لطیف، لاہور، جولائی ۱۹۵۶ء ص ۲۰۔

۶۔ روزنامہ امروز، لاہور، ۲۶ جون ۱۹۵۶ء ص ۵۔

۷۔ شیرازہ، لاہور، ۸ جون ۱۹۳۹ء ص ۱۵۰۔

۸۔ ادب لطیف، لاہور، جولائی ۱۹۶۵ء ص ۲۴۔

۹۔ نیا دور، کراچی، شمارہ ۷۹-۸۰ ص ۲۹۴۔

۱۰۔ گرد راہ، ص ۵۵۔

۱۱۔ سید ضمیر جعفری، کتابی چہرے، راولپنڈی، نیرنگ خیال پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء ص ۲۶

۱۲۔ فیض احمد فیض، متاع لوح و قلم، کراچی، مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۷ء ص ۲۰۲

۱۳۔ روزنامہ امروز، لاہور، ۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء

۱۴۔ عاشق حسین بٹالوی، چند یادیں، چند تاثرات، لاہور، آئینۂ ادب ۱۹۶۹ء ص ۱۸۷۔

۱۵۔ ادب لطیف، لاہور، جولائی ۱۹۵۶ء ص ۴

۱۶۔ چراغ حسن حسرت، مطائبات، لاہور، اردو اکیڈمی، ۱۹۳۱ء ص ۱۱۳۔

۱۷۔ ایضاً ص ۱۰۷۔

۱۸۔ عبدالمجید سالک، یاران کہن، لاہور، مطبوعات چٹان، ۱۹۶۷ء ص ۲۱۶۔

۱۹۔ نصراللہ خاں، کیا قافلہ جاتا ہے، کراچی، مکتبۂ تہذیب و فن، ۱۹۸۴ ص ۵۵۔

۲۰۔ کتابی چہرے، ص ۲۹۔

۲۱۔ نورتن ص ۹۶-۹۷

۲۲۔ ادبِ لطیف، لاہور، جولائی ۱۹۵۶ء ص ۲۱ ۔

۲۳۔ ایضاً ص ۴ ۔

۲۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تنقید اور تجربہ، کراچی، مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۷ء ص ۲۵۵ ۔

۲۵۔ سویرا، لاہور، نیا ادارہ، نومبر ۱۹۴۹ء ص ۱۷ ۔

۲۶۔ ایضاً ص ۱۹ ۔

۲۷۔ ایضاً ص ۲۱ ۔

۲۸۔ ایضاً ص ۲۱ ۔

۲۹۔ نورتن ص ۸۲ ۔

۳۰۔ آفتاب، کلکتہ جنوری ۱۹۲۶ء ص ۲

باب چہارم

متن

ا : غزلیات

ب: نظمیں

ج : بچوں کی نظمیں

سازِ عشق

(غزل)

دیر سے گرمِ جستجو تھی مری چشمِ آرزو

دل کے صنم کدے میں آ او بتِ عشوہ سازِ عشق

چُن لیا اُس نے دل مرا صدقے اس انتخاب کے

کتنا اداشناس ہے دیدۂ امتیازِ عشق

فرشِ زمیں سے عرش تک ایک نوائے درد ہو

مطربِ حسن چھیڑ دے اک ذرا تارِ سازِ عشق

کِس کا حرم کہاں کا دیر کہہ دو بس اب تو ہو چکی

میری جبینِ سجدہ ریز وقفِ حریمِ نازِ عشق

افکارِ حسرت ۲

(غزل)*

تبسم پیامِ قضا ہو گیا
یہ اک جنبشِ لب میں کیا ہو گیا

پڑی جس پہ تیری نگاہِ کرم
وہ مستغنیِ ماسوا ہو گیا

شبِ ہجر کا یہ شورِ نالہ
لبوں تک جو پہنچا گلا ہو گیا

طرب خانۂ آرزو تھا کبھی
یہی دل جو ماتم سرا ہو گیا

---

* یہ غزل مزاج حیدرآبادی کی غزل پر کہی گئی تھی جس کا مطلع ہے ؎

تعلق ہجومِ بلا ہو گیا ۔ طبیعت تجھے ہٹ کے کیا ہو گیا

چراغ حسن حسرت کرنل مسعود کو ایک خط میں لکھتے ہیں "وہ نوجوانی کے زمانے میں جب میری مشقِ سخن کا آغاز تھا مزاج کی اس غزل پر میں نے بھی غزل کہی تھی۔ مولانا حالی کے ہاں بھی اس طرز کی ایک غزل موجود ہے جس کا ایک شعر ہے۔

؎ نہیں بھولتا تیری رخصت کا وقت ۔ وہ مل مل کے رونا بلا ہو گیا"

نعرۂ مستانہ ۳

(غزل)

نہیں ہوں ایک میں ہی مست تیری بزمِ ناز میں
زمیں سے آسماں تلک جو چیز ہے سو مست ہے

اگر کوئی بلندیوں سے آشنا کرے اُسے
تو سامنے نگاہ کے فرازِ عرش پست ہے

دلِ شکستہ ہو سکیگا کیا حریفِ عاشقی
قدم قدم پہ کارزار عشق میں شکست ہے

نگاہِ فتنہ ساز کے یہ سارے امتیاز ہیں
جو غور کیجیئے تو کچھ بلند ہے نہ پست ہے

دماغ و دل میں ارتباط ہو تو کس طرح سے ہو
یہ بندۂ خرد ہے اور وہ جنوں پرست ہے

غزل ۴

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھکو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے *

محبت تیرے جلوے کتنے رنگارنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے ٥

امیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی "ہاں" بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

---

* چراغ حسن حسرت، کرنل مسعود کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "وہ جو میں نے کہا ہے ع آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے۔ تو وہ اصل میں نظیری کے اس مصرع نے سجھایا تھا۔ ع گریبانم گریبانست و دامن دامن است امشب" اس مصرعے کا پہلا مصرع ہے ع شمارے تا سحر دستم بزلفِ عنبریں دارد۔

٥ کسی صاحب نے حسرت کے مذکورہ بالا شعر پر اعتراض کیا تھا کہ یہ شعر سیماب کے شعر کا چربہ ہے۔

ع ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی۔ جہاں محسوس ہوتی تھی وہیں محسوس ہوتی ہے۔

حاجی لق لق نے "فکاهات" میں لکھا کہ حسرت کی غزل سیماب کے اس شعر سے پہلے کہی گئی تھی۔ حسرت کی یہ غزل جب "آفتاب" کلکتہ (۱۹۲۶) میں شائع ہوئی تو آغا حشر کاشمیری نے ایک خط میں اس غزل کی داد دی۔ (بحوالہ زمیندار ۳۰ اپریل ۱۹۲۹)

غزل

اُن سے پہلی سی ملاقات گئی
وہ جو اک بات تھی وہ بات گئی

عشق کی گرمیٔ بازار کے ساتھ
حُسن کی ساری کرامات گئی

اب کے برسات میں بھی پی نہ ملے
ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

غزل[۶]

انداز حسنِ یار بھی کیا تازہ کار ہے
ہے جانستاں کبھی تو کبھی جانسپار ہے

کچھ اور بڑھ گئے مرے عصیاں کے حوصلے
جب سے یہ سُن لیا ہے وہ آمرزگار ہے

اک وہ ہیں جن کو عمرِ ابد کی ہے آرزو
اک ہم وبالِ زندگیٔ مستعار ہے

پھر طورِ دل ہے جلوہ گہِ برقِ حسنِ یار
برپا نیاز و ناز میں پھر کارزار ہے

پھر دستِ آرزو میں ہے دامن خیال کا
آ اے شبِ سیاہ ترا انتظار ہے

حسرت یہ بے خودی ہے کہ اتنی خبر نہیں
اُن کی نظر ہے یا ستمِ روزگار ہے

غزل

*یہ کیا کہ جنوں عقل سے بیگانہ بنا دے
دیوانہ وہی، تو جسے دیوانہ بنا دے

وارفتگیٔ قیس کو افسانہ بنایا
یارب مری وحشت کو بھی افسانہ بنا دے

ڈرتا ہوں کہ اس چشمِ فسوں ساز کی گردش
احساسِ تمنّا کو تمنّا نہ بنا دے

اے عقل الٹنے دے نقابِ رُخِ فطرت
اس نقشِ خیالی کو معمّٰی نہ بنا دے

---

* یہ غزل پہلے 'نیرنگِ خیال' لاہور، اپریل ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ پہلے شعر کے مصرعِ اوّل میں 'یہ' کی بجائے 'وہ' استعمال کیا گیا ہے۔ پھر 'شیرازہ' لاہور جنوری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تو 'یہ' کے لفظ کے ساتھ چھپی۔

جہازیات[۸]

(غزل)

وہی ہے دل وہی دلدار دیکھیئے کیا ہو
وہی ہے سر وہی دیوار دیکھیئے کیا ہو

بکھر گئے رُخِ روشن پہ گیسوئے مشکیں
ہم ہیں کافر و دیندار دیکھیئے کیا ہو

وہ میرے دل کا تقاضا کہ فیصلہ ہو جائے
اور اُن کا کہنا یہ ہر بار دیکھیئے کیا ہو

الٰہی خیر ہو عاشق کے جیب و داماں کی
چھڑا ہے قصۂ تلوار دیکھیئے کیا ہو

جہاز دل کا ہوا مبتلائے موجِ بلا
ہے پاس ڈانڈ* نہ پتوار دیکھیئے کیا ہو

جناب شیخ کو سودا ہے دلفروشی کا
نہیں یہ بھوسے کا بیوپار دیکھیئے کیا ہو

ہے سندباد کو اصرار اُن سے ملنے پر
انہیں ہے ملنے سے انکار دیکھیئے کیا ہو

---

* ڈانڈ ۔ ناؤ کھینے کی بلی ۔ چپّو

باتیں کریں۹

(غزل)

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی رخسار کی باتیں کریں

آؤ چھیڑیں داستانِ صبحِ حشر
وعدۂ دیدار کی باتیں کریں

پھول برسائیں بساطِ عیش پر
روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں

زلفِ عنبر بار کے قصے سنائیں
طرۂ طرار کی باتیں کریں

نقدِ جاں لیکر چلیں اُس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں

اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کہیں
سایۂ دیوار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

غزل!

اُن سے تھا ایک رابطہ نہ رہا
کوئی جینے کا آسرا نہ رہا

جب سے تم آشنا ہوئے میرے
کوئی دنیا میں آشنا نہ رہا

تم رہو محبتِ رقیب رہے
میرا کیا ہے رہا رہا نہ رہا

غیر کے تم تھے، غیر کے تم ہو
دل مرا تھا مگر مرا نہ رہا

جہازی زبان

(غزل)*

یہ جو گلباز خان ہے پیارے
آفریدی پٹھان ہے پیارے

میرے چہرے کی جھریوں پہ نہ جا
دل ابھی تک جوان ہے پیارے

آرزو شوق حسرت و ارماں
اس کا خاندان ہے پیارے

ناک تیری ہے ناک، آنکھ ہے آنکھ
اور ترا کان، کان ہے پیارے

چل ہی نکلے گا مرے دل کا جہاز
زلف سا بادبان ہے پیارے

دل کا ٹٹو ہزار اڑیل ہو
آرزو کوچبان ہے پیارے

دیکھ سر قدِ یار کہتا ہوں
تری اونچی دکان ہے پیارے

کون سمجھے گا سندباد کے شعر
یہ جہازی زبان ہے پیارے

---

* جگر کی زمین غزل ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎ آکہ تجھ بن بہت دنوں سے یہ دل۔ ایک سونا مکان ہے پیارے
اسی زمین میں حفیظ جالندھری کی بھی ایک غزل موجود ہے۔ جس کا مطلع ہے۔
؎ دل ابھی تک جوان ہے پیارے۔ کس مصیبت میں جان ہے پیارے

غزل[۱۲]

یا رب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا *

جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دُعا ہوتا

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی

وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

ناکامِ تمنّا دل اس سوچ میں رہتا ہے

یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا کیا ہوتا

اک عشق کا غم آفت، اور اس پہ یہ دل آفت

یا دل نہ دیا ہوتا، یا غم نہ دیا ہوتا ٥

غیروں سے کیا تو نے، غیروں سے سُنا تم نے

کچھ ہم سے کیا ہوتا، کچھ ہم سے سُنا ہوتا ×

---

* اشاعتِ اوّل میں یہ مصرع یوں تھا ع اے شوقِ جنوں پرور اتنا تو کیا ہوتا

٥ "فنون" کے غزل نمبر میں "یا غم نہ دیا ہوتا" پہلے لکھا گیا ہے جو کہ درست نہیں ہے

× یہ غزل پہلی بار شیرازہ لاہور ۲۴ جنوری ۳۷ ص ۹۸ پر اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی "ذیل کی غزل اس سے پہلے کہیں نہیں چھپی البتہ بعض مشاعروں میں ضرور پڑھی گئی ہے۔"

غزل [۱۳]

ایک ہنگامہ سرِراہ گزر ہے کہ نہیں
میری آہوں سے جہاں زیر و زبر ہے کہ نہیں

مجھے پینے کا سلیقہ نہ سہی یہ کہیے
پاؤں پر ساقیٔ مے خانہ کا سر ہے کہ نہیں *

شرحِ غم پہ یہ ستم عرضِ وفا پہ یہ جفا
بے وفا کچھ تجھے اللہ کا ڈر ہے کہ نہیں

شمعیں بجھنے لگیں، کہرام ہے پروانوں میں
رُخِ روشن سے عیاں نورِ سحر ہے کہ نہیں

انہیں رونے سے جو فرصت ملے اتنا پوچھوں
حسرتِ زار کی آہوں میں اثر ہے کہ نہیں

---

* ایک مقام پر ساقیٔ مے خانہ کے ... درج ہے جو کہ مناسب ہے۔

غزل ۱۲

رندانِ مے پرست تو محفل سے اُٹھ گئے
تھرا رہے ہیں میکدہ کے بام و در ہنوز

آتی ہے بادِ غالیہ مُو صحنِ باغ سے
مُرغِ قفس کو ہے ہوسِ بال و پر ہنوز

اک چشمِ التفات نے سب کچھ بھلا دیا
تارِ نظر ہے بخیۂ زخمِ جگر ہنوز

اٹھتا نہیں ہے خرمنِ صیّاد سے دھواں
فریاد نارسا ہے، فغاں بے اثر ہنوز

نے کاہشِ فراق نے لطفِ وصالِ دوست
شام و سحر مرے نہیں شام و سحر ہنوز*

رسمِ عتاب ہے ابھی دنیائے عشق میں
تیرِ نگہ کی زد میں ہیں قلب و نظر ہنوز

---

* بعض مقامات پر مصرع یوں درج ہے ؏ شام و سحر نہیں مرے شام و سحر ہنوز

غزل[۱۵]

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قہر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

دل یہ مانا کہ اعتبار نہیں
اور اگر اعتبار ہو جائے *

زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی
موت ہی غمگسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

---

* اس شعر کے دونوں مصرعوں میں 'اعتبار' کی بجائے 'اختیار' کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

غزل[16]

شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی
زندگی مختصر نہیں ہوتی

زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شبِ غم مختصر نہیں ہوتی

غیر پہ جس سے بہرہ یابِ کرم
ہم پہ کیوں وہ نظر نہیں ہوتی

زندگی چارہ گر نہیں، نہ سہی
موت کیوں چارہ گر نہیں ہوتی

آج کی رات کٹ گئی تو کیا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

غزل

جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز
سوز ہے سوز اور نہ ساز ہے ساز

میں ہوں اور میری بے پروبالی
دل ہے اور دل کی جرأتِ پرواز

حُسن کی برہمی معاذ اللہ
گیسوؤں کے بکھرنے کا انداز

زلفِ برہم، جُھکی ہوئی نظریں
گردنِ ناز میں کمندِ نیاز

قد بالا و دامنِ کوتاہ
منزلِ عشق کے نشیب و فراز

اللہ اللہ کیفِ نغمۂ عشق
سارا عالم ہے گوش بر آواز

قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غمِ یار تیری عمر دراز

غزل[۱۸]

دشمن جوانیوں کی یہ آشنائیاں ہیں
اِن آشنائیوں میں کیا کیا برائیاں ہیں

مینا بدوش ساقی، ساغر بدست واعظ
ابرِ بہار نے کیا دھومیں مچائیاں ہیں

شاخِ سمن میں گویا لالہ کھلا ہوا ہے
گلرنگ چوڑیاں ہیں گوری کلائیاں ہیں

قسمت کی کیا شکایت تقدیر کا گلہ کیا
جتنی برائیاں ہیں دل کی بلائیاں ہیں

حسرت کہو کہ کس سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
ہونٹوں پہ سرد آہیں منہ پر ہوائیاں ہیں

غزل[19]

اس طرح دل کو مرے کر گیا ویراں کوئی
اب تمنا کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی

مے چکاں لب، نظر آوارہ گریباں صد چاک
یوں مرے پہلو سے اٹھا ہے غزل خواں کوئی

نغمۂ درد سے ہو جاتا ہے عالم معمور
اس طرح چھیڑتا ہے تارِ رگِ جاں کوئی

ہر کلی میں ہے ترے جوشِ جوانی کی نمود
اب کے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی

زلف برہم ہے دل آشفتہ صبا آوارہ
خوابِ ہستی سا نہیں خوابِ پریشاں کوئی

رند مے خوار بھی، جنت کا طلب گار بھی ہے
آج حسرت سا نہیں مردِ مسلماں کوئی

غزل[۲۰]

آپ کا اعتبار کون کرے
حشر تک انتظار کون کرے

ہم ہیں مجبور آپ ہیں مختار
جبر کو اختیار کون کرے

گر پڑا شہسوار گھوڑے سے
اب اُسے پھر سوار کون کرے

خود ہیں امیدوارِ کونسل آپ
خود کو امیدوار کون کرے

آپ ہیں اور شکار دونوں کے
دل کا اب یاں شکار کون کرے

گلبانگ پریشاں

افکار پریشاں

افکار و واردات *

ایک سجدہ بچ گیا ° تھا نقش پائے ناز سے

شکر ہے وہ آستانِ یار کے کام آگیا

دل کہاں اک قطرۂ خوں رہ گیا تھا نیم کش

وہ بھی اپنے دیدۂ خوں بار کے کام آگیا

دل ہے اور شغلِ ماتمِ ہستی

دیدہ ہے اور خوں فشانی ہے

آپ اور داستانِ سینہ

مہربانی ہے مہربانی ہے

امیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت

غبارِ راہ کا مجھکو گماں ہوتا ہے منزل پر ×

---

* یہ عنوانات حسرت نے متفرق اشعار پر خود قائم کیئے ہیں۔ ° ایک مقام پر بچ رہا تھا درج ہے۔

× درج بالا چھ شعر 'افتاب' کلکتہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ کی مختلف اشاعتوں میں طبع ہوئے۔

سرو و گل، قمری و بلبل کی حکایت نہ رہی

حُسن کا قصہ گیا، عشق کا افسانہ گیا

جس کے ہنگاموں سے تھی درد کی دنیا آباد

آج محفل سے تری وہ دلِ دیوانہ گیا

رونقِ بزمِ تماشا تھی کسی کے دم سے

شمعِ محفل ہوئی افسردہ تو پروانہ گیا

اُف وہ ساقی کی نگاہِ التفات

ایک مستی بن کے مجھ پر چھا گئی

محبت ہے اسی کا نام شاید

کوئی دل میں سمایا جا رہا ہے

آپ کا ذکر بیٹھتے اٹھتے

آپ کی یاد جاگتے سوتے

عشق نے حُسن کو بنایا حُسن

ہم نہ ہوتے تو آپ کیا ہوتے *

---

* اس صفحہ پر درج اشعار 'آفتاب' کلکتہ ۱۹۲۶-۲۷ کی مختلف اشاعتوں میں سامنے آئے۔

میں ہی کم بخت تری بزم میں ناشاد نہیں

کون سا لب کہ ہے، آمادۂ فریاد نہیں

روز دیتا ہے مجھے داغِ جدائی اے چرخ

کیا تجھے اور کوئی طرزِ ستم یاد نہیں

حُسن آیا مے جنوں پلانے

آنکھوں میں لئے شراب خانے

لہرائی ہوئی ہے زلفِ نکہت

کیا پھول سے کہہ دیا صبا نے

کیا فائدہ ترکِ مدعا سے

کیا دے دیا عرضِ مدعا نے

نظر ایک بجلی گرا جائے گی

مرے دل کو دل تو بنا جائے گی

تری آرزو دل سے کیا جائے گی

اسی کھیل میں موت آجائے گی

مری یاد آنے کو برسوں نہ آئے

جب آئے گی پہروں رُلا جائے گی ★

★ درج بالا آٹھ شعر "شیرازہ" لاہور ۳۷-۱۹۳۹ کی مختلف اشاعتوں میں طبع ہوئے۔

غمِ آرزو کو نہ تازہ کر دلِ بے خبر یہ وہ آگ ہے

جو سلگ اٹھی تو سلگ اٹھی، جو دبی رہی تو دبی رہی

قبول اس بارگاہ میں التجا کوئی نہیں ہوتی

الٰہی یا مجھے ہی التجا کرنا نہیں آتا

فلک کو میری تباہی کا حوصلہ کب تھا

شریک ہے نگہِ یار بھی مٹانے میں

محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے

محبت ہے لیکن بڑا کام کیا ہے

ترا آستاں جو نہ مل سکا تری رہگزر پہ جبیں سہی

ہمیں سجدہ کرنے سے کام ہے جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

یہ تمام عرصۂ کائنات ہے فکر کے لئے اک قدم

تجھے کر ہی لیں گے تلاش ہم تری جلوہ گاہ کہیں سہی

عشق وہ ہے رگ رگ سے جس کا جوش ظاہر ہو

بادہ ہو اگر بادہ پھوٹ نکلے مینا سے ★

★ پیشِ نظر اشعار "شیرازہ" لاہور ۱۹۲۷-۲۹ کے مختلف شماروں میں اشاعت پذیر ہوئے۔

دمِ آخر وہ آ گئے حسرت

موت سے اب کوئی بہانہ کریں ★

میرے دردِ عشق کو رسوا کیا

آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

حُسن کو خود بین و خود آراء کیا

اے نیازِ عاشقی یہ کیا کیا

حسرت کو لے تو آئیں تری بزمِ ناز میں

کم بخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

اے قیس دیکھو ناقۂ لیلیٰ نہ ہو کہیں

بجلی سی اک چمکتی ہے منزل کے سامنے

راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

ہماری نامرادی کا فسانہ

یہ کس کس کو سنایا جا رہا ہے

★ یہ شعر "شیرازہ" لاہور ۲۴ اگست ۱۹۳۷ء میں طبع ہوا۔

دریائے الفت طوفاں بہ طوفاں
تم اُس کنارے ہم اس کنارے

بے سبب پھر یہ التفات نہیں
کوئی فتنہ نیا اُٹھائیے گا
آپ اور سوگ میرے مرنے کا
یہ کسی اور سنائیے گا
اُٹھ کے پہلو سے جا رہے ہیں آپ
دل سے کیسے نکل کے جائیے گا

میری جبینِ سجدہ ریز تیرا حریمِ ناز ہو
مجھ سا جنوں پرست ہو تجھ سا جنوں نواز ہو

کس کو بھولیں گی یہ راتیں
یاد آؤ گے یاد کرو گے

تیرا جمالِ دلفروز کم نہیں مہروماہ سے
کیوں نہیں دیکھتے تجھے لوگ مری نگاہ سے

یہ ناکامی کہیں وجہ سکونِ دل نہ بن جائے

غمِ بے حاصلی ہی عشق کا حاصل نہ بن جائے

نہیں ہے دل تو کیا پہلو میں ہلکی سی خلش تو ہے

یہ ہلکی سی خلش ہی بڑھتے بڑھتے دل نہ بن جائے

ہجومِ شوق اور راہِ محبت کی بلاخیزی

خیالِ دوریٔ منزل کہیں منزل نہ بن جائے ★

یار کا انتظار رہتا ہے

ہلکا ہلکا بخار رہتا ہے

جب سے آیا نہیں ہے تار اُن کا

پیرہن تار تار رہتا ہے ٥

نظر ہے جانبِ در دل کو بھی قرار نہیں

یہ کیسے کہدوں کہ وعدے کا اعتبار نہیں

مرے نصیب میں ہے یا عدو کی قسمت میں

تیری طرح، تیرے وعدے کا اعتبار نہیں

★ یہ تین شعر "آزاد کشمیر" عید الاضحیٰ نمبر ۲۹ جون ۱۹۵۸ میں شائع ہوئے۔ صفحات کا اندراج نہیں ہے۔

٥ ایضاً۔

حقہ پیتا ہے شعر کہتا ہے
اور عاشق میں کیا برائی ہے *

کیا واہ کی جاگیر پہ نازاں ہے سکندر°
قبضہ میں حجازی کے بھی ہے اک آہ کی جاگیر

---

* یہ شعر مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں ہے۔ موصوف کا جو قلمی خاکہ حسرت نے لکھا تھا اُس ہی یہ شعر موجود ہے

° یہ شعر۔ سکندر حیات خاں (صوبۂ پنجاب کے دورِ خود مختاری کے پہلے وزیرِ اعظم) ۱۸۹۲ء۔ ۱۹۴۲ء) کے وطنِ مالوف 'واہ' ضلع کیمبل پور (اٹک) کے بارے ہی لکھا گیا۔ چراغ حسن حسرت لکھتے ہیں۔ "واہ اور آہ کا ذکر چھیڑا تو ایک عزیز دوست نے فرمایا" واہ کی جاگیر" اچھی زمین ہے اس ہی غزل لکھ ڈالو لیکن غزل کے اہتمام کا حوصلہ کسے تھا۔ سنگلاخ زمین چکنا فرش جس پر راہوارِ تخیل کے قدم پھسلتے ہیں۔ اور قلم کی عناں ہاتھ سے چھوٹی جاتی ہے صرف ایک شعر ہو سکا"۔ (بحوالہ مطائبات ص ۲۰)

حوالہ جات

۱۔ آفتاب، کلکتہ، جنوری ۱۹۲۶ء ص ۴۳

۲۔ ایضاً اپریل/مئی ۱۹۲۶ء ص ۴۹

۳۔ ایضاً جون ۱۹۲۶ء ص ۳۹

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً ۱۹۲۷ء

۶۔ ایضاً مارچ/اپریل ۱۹۲۷ء ص ۹

۷۔ نیرنگِ خیال، لاہور، ۱۹۳۵ء

۸۔ روزنامہ احسان، لاہور، ۱۸ مئی ۱۹۳۶ء

۹۔ شیرازہ، لاہور ۲۴ دسمبر ۱۹۳۶ء

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً ۸ جنوری ۱۹۳۷ء

۱۲۔ ایضاً ۲۴ جنوری ۱۹۳۷ء

۱۳۔ ایضاً ۱ جولائی ۱۹۳۷ء

۱۴۔ ایضاً ۲۴ اگست ۱۹۳۷ء

۱۵۔ ایضاً ۱ ستمبر ۱۹۳۷ء

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً ۸ جون ۱۹۳۷ء

۱۸۔ ایضاً جولائی ۱۹۳۹ء

۱۹۔ ایضاً ۸ جولائی ۱۹۴۰ء

۲۰۔ آزاد کشمیر (عید الاضحیٰ نمبر) جلد ۶ شمارہ ۲۵/۲۹ جون ۱۹۵۸

"تو"

بلبل کی نوائے درد میں تو
ناکام کی آہِ سرد میں تو
ہنگامۂ ہست و بود تجھ سے
ہے کارگہِ وجود تجھ سے
شیرینیٔ خندۂ سحر میں
حسرت کی فغانِ بے اثر میں

تو ہے مری آرزو میں، تو ہے
تو ہے مری جستجو میں، تو ہے

افسانۂ دل ۲

بادلوں کی سرزمیں ایک آتش پارہ تھا — برقِ مضطر کی طرح جو رات دن آوارہ تھا

بجلیاں دیتی تھیں درسِ خانہ ویرانی اُسے — مضطرب رکھتی تھی اس کی شعلہ سامانی اُسے

اُس کی فطرت درد و مایوسی کی تھی سرمایہ دار — دور تھا اُس کے بیاں سے عالمِ صبر و قرار

گہ ملک سبحۂ زرتار کا دانہ بنا — اور کبھی شمعِ تمنا کا وہ پروانہ بنا

حسن کی پریوں کی گودی میں مچلتا بھی رہا — شمع بن کر شوق کی محفل میں جلتا بھی رہا

مدتوں اڑتا رہا وہ عالمِ تخئیل میں — اور رہا برسوں فروزاں عرش کی قندیل میں

مدتوں دامن میں رکھا آرزوؤں نے اُسے — در بدر پھرنا سکھایا جستجوؤں نے اُسے

خالقِ کونین کا فرماں بجالانا پڑا — یعنی پستی کی طرف ایک دن اُسے آنا پڑا

میری الفت کی ضیاء سے ماہِ کامل بن گیا
میرے سینے میں اُتر آیا مرا دل بن گیا

قطعہ ۲

پھر وہی ہیں وہی نظر اُن کی
دیدہ و دل کی یاریاں نہ گئیں
شوق کی بے حجابیاں نہ مٹیں
عقل کی پردہ داریاں نہ گئیں

فلسفۂ حیات ۲

ہزار روکتا ہوں میں نگاہ کو اپنی
فرازِ عرش سے پھر بھی گزر ہی جاتی ہے
بلندیوں پہ پہونچتی ہے جب نظر میری
صدا یہ روح کی گہرائیوں سے آتی ہے

نظر فلک پہ ہے، غافل ہے اپنی ہستی سے
بلندیاں بھی تو قائم فقط ہیں پستی سے

برکھا رت کی ایک رات ٥

"تصویر دیکھ کر"

(اہ نجالدؔ)

اک فتنہ گر حسینہ جادو نظر حسینہ
اک حور ماہ پیکر محبوب مہر منظر
بیٹھی ہے سر جھکائے پیتم سے لو لگائے

آنسو نکل رہے ہیں
چشمے اُبل رہے ہیں
ارماں مچل رہے ہیں
پہلو بدل رہے ہیں

ہونٹوں پہ سرد آہیں اور مضطرب نگاہیں
الجھے ہوئے ہیں گیسو بیتابیوں کے پہلو
پی کی لگن لگی ہے اگنی سلگ رہی ہے
آنکھیں ہیں جستجو میں دل غرق آرزو میں

ہر چیز سو رہی ہے
مدہوش ہو رہی ہے
وہ ہے کہ رو رہی ہے
دامن بھگو رہی ہے

گردونِ دلبری کا چرخِ فسوں گری کا
ٹوٹا ہوا ہے تارا اخگر ہے یا شرارا
اک شمع ہے لگن میں سورج ہے یا گہن میں
بلبل ہے یا قفس میں مجبوریوں کے بس میں

آنسو بہا رہی ہے
موتی لٹا رہی ہے
تن من جلا رہی ہے
طوفاں اُٹھا رہی ہے

بادل گرج رہے ہیں طنبور بج رہے ہیں
تاریکیاں ہیں لرزاں اور بجلیاں ہیں رقصاں
فطرت کا ذرّہ ذرّہ کچھ سوچتا ہے گویا
اک خامشی کا عالم وارستگی کا عالم

سکتہ ہے شب کا جاری
اور کائنات ساری
مصروفِ اشکباری
اک بے خودی سی طاری

حُسن ۶

(۱)

فضائے لالہ زار میں

ہوائے شکبار میں

صدائے جوئبار میں

نوائے شاخسار میں

ہر ایک شے میں حسن ہے ہر ایک شے میں حسن ہے

________ مگر تو دیکھتا نہیں

(۲)

سکوتِ کوہسار میں

فغانِ آبشار میں

تبسمِ بہار میں

ترنمِ ہزار میں

کلی کلی میں حسن ہے گلی گلی میں حسن ہے

________ مگر تو دیکھتا نہیں

(۳)

نیاز اور ناز میں

نشیب میں فراز میں

دلوں کے سوز و ساز میں

بتوں کی ترکتاز میں

یہ حُسن جلوہ سوز ہے یہ حسن جاں فروز ہے

________ مگر تو دیکھتا نہیں

(۴)

بلند و پست خشک و تر

مناظرِ شب و سحر

وہ جھٹپٹا وہ دوپہر

وہ کوہ و دشت بحر و بر

وہ ظلمتِ ردائے شب سکوت فتنہ زائے شب

________ مگر تو دیکھتا نہیں

(۵)

شفق کی لالہ کاریاں

وہ سُرخ زرد دھاریاں

وہ شب کی کیف باریاں

وہ شب کی پردہ داریاں

وہ ڈالیوں کا جھومنا عذارِ گل کو چومنا

________ مگر تو دیکھتا نہیں

(۶)

یہ نیلا نیلا آسماں

یہ تارے اور یہ کہکشاں

یہ عکس ماہِ ضوفشاں

یہ آب جو رواں دواں

یہ جلوہ ہائے حُسن ہیں جو رانمائے حسن ہیں

________ مگر تو دیکھتا نہیں

(۷)

کہیں ولادتِ پسر

کہیں عدم کا ہے سفر

لئے جنازہ دوش پر

چلے اقربا برہنہ سر

اس ابتداء میں حسن ہے اس انتہا میں حسن ہے

——— مگر تو دیکھتا نہیں

(۸)

ہے اک نگارِ مہ جبیں

حسین اور اس قدر حسین

کہ میری ادائے دل نشیں

ہے رہزنِ متاعِ دیں

وہ اس کی چشمِ سرمگیں وہ اُس کی زلفِ عنبریں

——— مگر تو دیکھتا نہیں

(۹)

ہے ایک خانماں خراب

اسیرِ پنجۂ شباب

شہیدِ جلوۂ شراب

رہینِ مطرب و رباب

ہے اُس کی مستیوں میں حسن ہے ہزیمتوں میں حسن

——— مگر تو دیکھتا نہیں

(۱۰)

ہے ایک جانِ مبتلا

سہاگ جس کا لٹ گیا

قتیلِ خنجرِ جفا

رہینِ نالہ و بکا

حسین ہے جمیل ہے بہار کی شبیہ ہے

——— مگر تو دیکھتا نہیں

(۱۱)

نگار بن گیا کہیں

بہار بن گیا کہیں

مزار بن گیا کہیں

شرار بن گیا کہیں

ہے سنگ سنگ میں نہاں ہے رنگ رنگ سے عیاں

——— مگر تو دیکھتا نہیں

(۱۲)

زمیں سے تابہ آسماں

ادھر ادھر یہاں وہاں

چمن چمن جہاں جہاں

یہ حسن ہے کہاں کہاں

بہ رنگِ بحرِ بے کراں ازل سے تا ابد رواں

——— مگر تو دیکھتا نہیں

(نا تمام)

آغازِ بہار *

آیا ہنگامِ مے پرستی — ہوئی آباد دل کی بستی
چھیڑا کلیوں نے ساز اپنا — افسانۂ جاں نواز اپنا
مے خانہ بدوش ہیں ہوائیں — یعنی مدہوش ہیں ہوائیں
پھر خاک میں جوشِشِ نمو ہے — دنیا، دنیائے رنگ و بو ہے
ساحل ہوشیار ہو رہے ہیں — فتنے بیدار ہو رہے ہیں
موجیں طوفاں اٹھا رہی ہیں — یعنی موتی لٹا رہی ہیں
فطرت اک گیت گا رہی ہے — مستی سی فضا پہ چھا رہی ہے

اک طفل حسین گل بداماں — آئینہ جبیں و فتنہ ساماں
رنگ و بو لے کے آ رہا ہے — مستی بن بن کے چھا رہا ہے

---

* یہ نظم "آفتاب" کلکتہ مئی ۱۹۲۷ء میں اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے "یہ نظم انگلستان کے مشہور مصور "والس" کی "ایک بچی گل بدست تصویر" پر لکھی گئی۔ اسی شمارے میں حسرت نے 'لمحات' کے زیرِ عنوان لکھا کہ "آغاز بہار" انگلستان کے مشہور مصور "والس" کی نادرہ کاری کا نمونہ ہے۔ اس فخر روزگار نقاش کی چند نادر تصویریں بھی پیش کریں گے"۔ اس نوٹ میں انگلستان کا اندراج درست نہیں۔ 'والس' کا تعلق اٹلی سے تھا۔ موصوف سولھویں صدی میں اٹلی کا مشہور پینٹر تھا (۱۴۹۵ء تا ۱۵۳۴ء) جو 'PAINTER OF THE GRACES' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا فن لیونارڈو ڈونچی (۱۴۵۲ء۔ ۱۵۱۹ء) سے بہت متاثر تھا۔ والس کے کئی فن پارے مشہور ہوئے جن میں 'MADONNA AND SAINTS' اور 'ENTOMBMENT OF CHRIST' بہت اہم ہیں۔ والس کی تصاویر کی بے شمار نقلیں بھی تیار کی گئیں۔ (ملخص: انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ جلد ۵۔ ص ۱۹۰ پندرھواں ایڈیشن)

۸

جوانی آئی اور صد حشر، فتنہ در کنار آئی

بہار آئی تری رنگیں اداؤں پر بہار آئی

جوانی آئی اور سیکھا ادا نے فتنہ گر ہونا

تری ترچھی نظر کو آگیا صرفِ نظر ہونا

جوانی آئی دل کو آرزوؤں کا پیام آیا

لگائیں بن گئیں مے خانہ، اور گردش میں جام آیا ★

★ ۱۹۳۰ء میں آغا سید لعل شاہ کے قہوہ خانے میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی فرمائش پر یہ اشعار سنائے گئے۔ بحوالہ تقریر سید غلام حسین کاظمی ریڈیو پاکستان (۶۶/۹/۱) راولپنڈی۔

کشمیر*

خطۂ کشمیر اے شعر و لطافت کے دیار | ذرہ ذرہ پر ترے رنگینیٔ فطرت نثار
صبح تیری ہے اگر پروردۂ آغوشِ نور | شام تیری مشک ریز و مشک بیز و مشک بار
تیرے باغ و راغ میں نغمہ پیرا صبح و شام | عندلیب و صلصل و قمری قطار اندر قطار
تیرے کوہساروں پہ چھایا ہے قیامت کا سکوت | وادیوں میں شور افگن ہے صدائے آبشار
لالۂ صحرا کا تیرے گلستانوں میں ہجوم | نرگسِ شہلا سے ہیں معمور تیرے مرغزار
چپہ چپہ سے ہویدا شاہدِ فطرت کا حسن | ذرّہ ذرّہ سے نمایاں صنعتِ پروردگار
وہ غبارِ عنبریں گلگونۂ روئے سحر | وہ شعاعِ احمریں شانہ کشِ زلفِ بہار
چھیڑتی ہے شاعرِ فطرت کے سازِ قلب کو | وہ صدائے جوئے بار اور وہ نوائے شاخسار
بھول جاتا ہے مُصلّے اور رکنا باد کو | دیکھتا ہے جب نشاطِ آور ڈل کی شام زرنگار
مدتوں توصیف میں تیری رہے ہیں نغمہ سنج | قدسی و صائبؔ، کلیم و عرفیِ معجز نگار
وادیوں سے تیری گزرے ہیں ہزاروں قافلے | یاد کرتا ہے جنہیں اب تک غبارِ راہ گزار
سبزہ زاروں میں ترے اکثر ہوئے ہیں خیمہ زن | دودمانِ بابری کے خسروانِ ذی وقار
مادرِ ہندوستاں کی آنکھ کا تارا ہے تو | کر دیا تو نے فزوں دنیا میں اُس کا اعتبار

آہ اے کشمیر اے معمورۂ حسن و جمال | اے کہ تو ہے سطوتِ اسلاف کا آئینہ دار
لٹ گئی تیری متاعِ شوکتِ دیرینہ حیف | مٹ گئے سب عظمتِ پارینہ کے نقش و نگار
علم و دولت سے تہی دامن ترے فرزند ہیں | جہل و غفلت اُن کا شیوہ کاہلی اُن کا شعار

کاش احساسِ عروجِ رفتگاں پیدا ہو پھر
اس زمیں سے ایک تازہ آسماں پیدا ہو پھر

---

* چراغ حسن حسرت کا جنم چوں کہ کشمیر میں ہوا اس لئے اس خطۂ جنت نظیر سے محبت فطری امر ہے۔ دو اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب "کشمیر" کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔

ہسپانیہ کی گلفروش لڑکی[10]

ہے دامانِ گردوں شفق زار یکسر　　فضا سے برستے ہیں انوار یکسر
ہوا آ کے سبزے کو لپکا گئی ہے　　صبا دشت و صحرا کو مہکا گئی ہے
ہے فردوس نزہت کا شاداب منظر　　تخیل کی دنیا کا پُرخواب منظر
سپہرِ لطافت کا رنگیں نظارا　　ہے اس عالمِ کیف میں جلوہ آرا
چمن زارِ انجم کی اک تیتری ہے　　شفق کی پرستاں کی ننھی پری ہے
یہ نغموں کا آہنگ پھولوں کا نقشا　　ستاروں کی تابش، کلی کا سراپا
ہے معمور دامن گل و یاسمیں سے　　اڑا لائی افشاں فلک کی جبیں سے

تو اپنی حقیقت سے نا آشنا ہے　　خبر ہے، کہ تو کون ہے اور کیا ہے
لہو کس کا تیری رگوں میں رواں ہے　　جبیں سے تری کس کی شوکت عیاں ہے
نگاہوں میں تیری حیا جلوہ گر ہے　　تجھے بھی خبر ہے یہ کس کا اثر ہے
شہوں کے نسب سے تھے اسلاف تیرے　　نژادِ عرب سے تھے اسلاف تیرے

خبر ہے، یہ زریں ستاروں کی دنیا　　خبر ہے، یہ رنگیں بہاروں کی دنیا
یہ اشبیلیہ کی معطر فضائیں　　ملاغہ کے باغوں کی ٹھنڈی ہوائیں
یہ دریائے تاجو کی پُرنور لہریں　　یہ کرنوں کی صہبا سے مخمور لہریں
خبر ہے تجھے گیت گاتی ہے کس کے　　شب و روز قصے سناتی ہے کس کے
خبر ہے کہ کہسار سیرا نویدا*　　ہیں عظمت کے آثار جس سے ہویدا
سناتا ہے افسانۂ باستانی　　عرب اور شکوہِ عرب کی کہانی
تھے اُن میں شہامت کے اطوار سارے　　تھے اُن میں شجاعت کے آثار سارے
سمندر کی عظمت ثریا کی رفعت　　پہاڑوں کی شوکت، فلک کی جلالت
فروزاں کیے شمعِ ایماں جگر میں　　لائے طورِ سینا کے جلوے نظر میں
وہ دنیا میں فضلِ خدا بن کے پھیلے　　کرن بن کے اٹھے ضیا بن کے پھیلے

---

* اسپین کے جنوب میں بحیرۂ روم کے ساحل کی جانب سلسلۂ کوہ 'SIERRA NEVADA'

نیا زمانہ

یہ غُل ہے بزمِ خرد میں بدل رہا ہے جہاں
تغیرات کے سانچے میں ڈھل رہا ہے جہاں

تجلیاں لئے ہمراہ صبحِ نو آئی
بنا ہے مطلعِ انوار چرخِ مینائی

ہر ایک چیز پہ چھایا ہے انقلاب کا رنگ
نیا ہے ساز زمانے کا اور نیا آہنگ

مگر جو غور کرو تو یہ اک فسانہ ہے
طلسمِ دیر میں جو کچھ ہے سب پرانا ہے

وہی ہے بزمِ کواکب وہی سرودِ خموش
وہی قمر، وہی آفتابِ جلوہ فروش

وہی ثوابت و سیّار کا سکون و خرام
وہی نمودِ سحر اور وہی ہے جلوۂ شام

وہی ہیں قلب و جگر لذتِ گداز وہی
وہی ہے کیفیتِ دردِ سوز و ساز وہی

طلب کا ذوق نیا ہے، نہ جستجو ہے نئی
فسونِ یاس نیا ہے نہ آرزو ہے نئی

ہے آسماں وہی دنیائے آب و گل ہے وہی
ہجومِ شوق وہی، ہم وہی ہیں دل ہے وہی

غمِ زمانہ وہی، فکرِ بیش و کم بھی وہی
ربابِ زیست وہی، اس کا زیر و بم بھی وہی

صحرا کی ایک صبح[۱۲]

نورِ سحر کے جلوے صحرا پہ چھا رہے ہیں
سنسان وادیوں میں سونا لٹا رہے ہیں
صہبائے بے خودی کے دریا بہا رہے ہیں
مدہوش کر رہے ہیں سب بے خود بنا رہے ہیں

صحرا کی وسعتوں میں جنت کے ہیں نظارے
بالو کے ٹیکروں پر بکھرے ہیں نور پارے
یا جگمگا رہے ہیں اوجِ فلک پہ تارے
جو رہرووں کو اپنی جانب بلا رہے ہیں

جلوے نکھر رہے ہیں مخمور ہیں ہوائیں
نور و سرور میں ہیں ڈوبی ہوئی فضائیں
ہیں چار سو جرس کی پھیلی ہوئی صدائیں
یثرب کو جانے والے یثرب کو جا رہے ہیں

ہونٹوں پہ مچلتے ہیں تقدیس کے ترانے
آنکھیں سنا رہی ہیں کچھ دکھ بھرے فسانے
اک آگ سی لگا دی تن من میں آ فضا نے
انوارِ صبح دل میں طوفاں اٹھا رہے ہیں

ان عاجزوں کو مولا فولاد کا جگر دے
خاکِ رہِ حرم کو تابانیٔ قمر دے
صحرا کے ساکنوں کو پھر بختیار کر دے
سازِ ہوا پہ ذرّے یہ گیت گا رہے ہیں

رباعیات [۱۳]

دیتے ہیں سب انبیاء گواہی تیری   دنیا تیری ہے دیں پناہی تیری
روشن تجھ سے ہے محفلِ کون و مکاں   ہے دونوں جہاں میں بادشاہی تیری

بخشی انساں کو ارجمندی تو نے   مسلم کو عطا کی مستمندی تو نے
ذروں کو فروغِ جلوۂ مہر دیا   پستی کو بنا دیا بلندی تو نے

اِس نورِ مبیں سے این و آں روشن ہیں   روشن ہیں زمین و آسمان روشن ہیں
ہے جلوہ فروز بزمِ کونین حضورؐ   اک شمع سے یہ دونوں مکاں روشن ہیں

اسکندر و دارا کا حشم کیا شے ہے ؟   اور دبدبۂ قیصر و جم کیا شے ہے ؟
ہو شاہِ عرب کا جس کی نظروں میں جلال   اس کے لئے شوکتِ عجم کیا شے ہے ؟

ڈھونڈا ہر چند خانقاہوں میں اُسے   اور دیر و حرم کی جلوہ گاہوں میں اُسے
آخر بڑی جستجو سے حسرتؔ ہم نے   پایا عاشق کی سرد آہوں میں اُسے

نغمۂ امید ★[۱۷]

مت رو کہ بہار ہو گئی ختم — ویراں ہوئی ولولوں کی بستی
یعنی بادِ خزاں کے ہاتھوں — تاراج ہوئی چمن کی ہستی
مت رو کہ نہیں ہوا میں مستی — وہ کیف نہیں رہا ہوا میں ○
مت رو کہ نہیں ہے نکہتِ گل — چھائی ہوئی ہر طرف فضا میں
مت رو کہ نہیں وہ باغ کا رنگ — چھائی ہوئی ہے خزاں کلی کلی پر ×
اور صبح کی چشم شبنم آلود — گریاں ہے مآلِ زندگی پر
مت رو کہ جفائے آسماں سے — پامال ہوئے زمیں کے تارے
رنگت ہوئی زرد پتیوں کی — کملائے ہوئے ہیں پھول سارے
یہ دن بھی مگر نہیں رہیں گے — یہ دورِ الم بھی مختصر ہے
یہ برگِ خزاں رسیدہ گویا — اک عہدِ طرب کا نامہ بر ہے
ٹوٹے گا طلسم نا امیدی — آئے گی بہار گل بداماں
آئے گی لیے ہوئے جلو میں — رنگینیوں کے ہزار ساماں

★ "سازِ مغرب" مرتبہ حسن الدین احمد، ولا اکیڈمی، حیدرآباد، اپریل ۱۹۷۷ء (جو دس جلدوں میں شائع ہوئی) حصہ نہم صفحہ ۴۰۰ پر اس نظم کو انگریزی کی کسی نظم کا ترجمہ قرار دیا گیا ہے لیکن انگریزی نظم کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

○ یہ نظم پہلے "اختر" لاہور، ستمبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی، پھر "شیرازہ" لاہور ۸ فروری ۱۹۲۷ء میں طبع ہوئی۔ شیرازہ میں کچھ لفظی تغیر موجود ہیں۔ ع وہ کیف نہیں رہا گھٹا میں - یا

× ع چھائی ہے خزاں کلی کلی پر۔

جہازیات[۱۵]

(او دیس سے آنے والے بتا)

(مولانا اختر شیرانی کی مشہور نظم کے تتبع میں چند اشعار)

(۱)

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یاران وطن

سبحانِ وطن ، رمضانِ وطن ، رحمانِ وطن، شعبانِ وطن ٭

وہ سروِ وطن ، دیودارِ وطن ، شمشادِ وطن، ریحانِ وطن

او دیس سے آنے والے بتا . . . . . .

(۲)

کیا اب بھی صبح سے شام تلک سورج کا سکہ چلتا ہے

گرمی کی سہانی راتوں میں کیا اب بھی چاند نکلتا ہے

پتھر کی چٹانوں پر کیا اب بھی پاؤں لگاہ پھسلتا ہے

او دیس سے آنے والے بتا . . . . . .

دریا کے رتیلے ساحل پر بھینس اب بھی ڈکرتی ہیں

کیا پتے اب بھی جھومتے ہیں کیا اب بھی ہوائیں گاتی ہیں

پیڑوں کے گھنے سائے کے تلے بھیڑیں اب بھی ممیاتی ہیں

او دیس سے آنے والے بتا . . . . . .

٭ پونچھ کے کشمیری خاندانوں میں عام طور پر سبحانہ، شعبانہ، رمضانہ اور رحمانہ وغیرہ نام ہوتے ہیں۔ مرحوم نے اپنے وطن کی یاد میں اس نظم میں سب ہم وطنوں کو یاد کیا ہے۔

(بحوالہ مضمون سردار علی اکبر مہاجر پونچھ روزنامہ تعمیر راولپنڈی ۹ جولائی ۱۹۵۵ء)

(۴)

مکھن، گھی، دودھ اور غلّے کا ہوتا ہے بیوپار اب کہ نہیں
سرتی ہے وصول کسانوں سے کیا مالیہ سرکار اب کہ نہیں
تحصیل کے پیادوں سے ہوتی رہتی ہے تکرار اب کہ نہیں

او دیس سے آنے والے بتا . . . . . .

(۵)

نجّو کی امّاں کیسی ہے، فتّو کی بٹیا کیسی ہے
جُمّے کی بھینس کا حال ہے کیا، رُسلے کی بچھیا کیسی ہے
موتی کا طوطا کیسا ہے، ملکھی کی مینا کیسی ہے

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن

جدید شاعری[16]

جوانی!

گراں مایہ جوانی !!!

کبھی شکر کی تلخی، اور کبھی حنظل کی شیرینی

کبھی کرنوں کی تاریکی، کبھی ہے نور ظلمت کا

کبھی کدو، کبھی شلغم، کبھی خرفہ، کبھی مولی

کبھی ہے ساگ پالک کا

کبھی دھوتی، کبھی تہمد، کبھی ٹوپی کبھی جوتا

کبھی وہ ہے، کبھی یہ ہے، کبھی یہ ہے کبھی وہ ہے

کہو تو ہم بھی آ جائیں

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا

سنا ہے عید کا دن ہے

جوانی! گراں مایہ جوانی !!!

لکھا راجہ رسالو نے یہ اک دن سالباہن کو

کہ کجلی بن کے مچھر خون پی کر بن گئے کچھی

نہ دریا ہے نہ کشتی ہے۔

بجائے کوئی کیسے بین اور کھائے تو کیا کھائے

ذرا دیکھو یہ طوطا ہے کہ پنڈت جی کی کبلی ہے

کہ گھر با چھوڑ کر بھاگا ہے کالے خاں کا گھسیارہ

پڑی ہے تھاپ طبلے پر اٹھا کر پھینک دو اس کو

یہی کیلے کا چھلکا ہے *

* "کیلے کا چھلکا" حسرت کے مضامین کا مجموعہ بھی ہے۔

جہاں رمضان رہتا تھا*

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

وہ اس کوچے کا لمبردار تھا آزاد رہتا تھا
بہت مسرور رہتا تھا بہت دلشاد رہتا تھا
لسانِ قیس ماہر صورتِ فرہاد رہتا تھا
جو اُس کو یاد رکھتا تھا وہ اس کو یاد رہتا تھا
اور اسی دالان میں اس کا چچا رحمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم . . . .

اسی چھپر تلے دن رات اُس کی چارپائی تھی
یہی دو چار کپڑے تھے، اور اک میلی رضائی تھی
وہ اس دنیا کا مالک تھا، یہی اُس کی خدائی تھی
اور اس کوچہ کے پنواڑی سے اُس کی آشنائی تھی
کبھی وہ کبھی یہ اس کے گھر مہمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم . . . .

* یہ نظم اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی "مولانا اختر شیرانی ایڈیٹر "رومان" کی نظم "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ پچھلے دنوں ایک صحبت میں مولانا کے تین عقیدت مند جناب خضر تمیمی، عزیزم عطاء اللہ سجاد اور راقم الحروف جمع ہوگئے اور باتوں باتوں میں اس نظم کا ذکر آگیا۔ مولوی خضر کی جان پہچان کے لوگوں میں میاں رمضان ایک بزرگوار تھے۔ ریحانہ کے تذکرہ میں انہیں بے اختیار وہ یاد آگئے اور چند منٹوں میں یہ ساجھے کی نظم لکھ ڈالی گئی۔ خدا کرے اختر کی ریحانہ کے طفیل ہمارا رمضان بھی زندگی جاوید حاصل کرے۔ (حجازی)

اِس کوچہ میں آوارہ دھواں ہے اُس کے حُقّے کا

فضا کا ذرّہ ذرّہ نوحہ خواں ہے اُس کے حُقّے کا

مگر دھندلا سا خاکہ کہکشاں سے ہے اُس کے حُقّے کا

ابھی ٹوٹا ہوا نیچا نشاں ہے اُس کے حُقّے کا

وہ حُقّہ جس کے دم سے اس کو اطمینان رہتا تھا

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم ....

ہے سُرمہ بے دلوں کی آنکھ کا اس کا غبار اب تک

اٹھائے پھر رہے ہیں ہیلچے کچھ خاکسار اب تک

یہاں چلتا ہے لنگڑا کر ہوا کا راہوار اب تک

جُھکا دیتے ہیں سرِ تیمور سے عالی وقار اب تک

یہیں کہتے ہیں پہلے اس سے ایم۔اے خان رہتا تھا

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

پانی

"آب داری" کوئی کیا خاک کرے
ہوا لاہور میں عنقا پانی

'پانی پی پی کے' ہمیں کوستے ہیں
کیجئے کیا نہیں ملتا پانی

"خاکساری" کا زمانہ آیا
یعنی مٹی سے ہے مہنگا پانی

ناظمِ بلدیہ کو شرم کہاں
ڈھل گیا آنکھ کا گویا پانی

بن گئیں آنکھیں مری واٹر ورکس
آنسوؤں نے وہ لٹایا پانی

خواجہ* صاحب کے قصیدے سُن کر
پانی پانی ہے ہر اک جاپانی

دیکھیے کیا ہو جہازی کا حشر
کہاں لے جائے یہ دانا پانی

* خواجہ حسن نظامی جو اُس زمانے میں جاپانیوں کے بہت بڑے مداح تھے۔

ایک پیرِ طریقت کے نام ★[19]

کوئی سیکھے جنابِ خواجہ سے ‏ ‏ منزلِ عشق کے نشیب و فراز

نگہ صدق کیا، ہوس ہے کیا ‏ ‏ کیا حقیقت ہے اور کیا مجاز

کبھی لب پر حکایتِ محمود ‏ ‏ کبھی افسانہ کہئے زلفِ ایاز

کبھی شاخِ نبات کی باتیں ‏ ‏ کبھی ازکار عارفِ شیراز

قدِ دلجو کا قصۂ رنگیں ‏ ‏ خمِ گیسو کی داستانِ دراز

شیخ و مُلا پہ طعنِ بے تابی ‏ ‏ آپ اور گفتگو کا یہ انداز

محتسب در قفائے رنداں است

غافل از صوفیانِ شاہد باز ہ

★ ان اشعار پر حسرت نے یہ نوٹ درج کیا "پچھلے دنوں ایک پیرِ طریقت نے علماء پر امرد پرستی کا الزام لگایا تھا یہ چند شعر جواب آں غزل کے طور پر شائع کیے جا رہے ہیں۔"

ہ شیخ سعدیؒ کا شعر ہے۔

محبت اور امید*

(ٹامس مور کی ایک نظم کا ترجمہ)

سمندر کے ساحل پہ صبحِ بہار — بچھاتی تھی کرنوں کا زرّیں ستار
جہاں غرق تھا نورِ خورشید میں — محبت تھی آغوشِ امید میں
محبت اٹھی مسکراتی ہوئی — تبسم کی بجلی گراتی ہوئی
اٹھی اور کشتی پہ ہوکر سوار — یہ بولی کہ ہمراہِ موجِ بہار
سنہری جزیروں کو جاتی ہوں میں — ابھی شام تک لوٹ آتی ہوں میں
فریبِ تبسم میں آئی امید — زباں پر شکایت نہ لائی امید
رہا اس کو دن بھر فقط ایک کام — کہ لکھتی رہی ریت پر اس کا نام
کبھی لہر جس کو بہالے گئی — کبھی موجِ صرصر اڑالے گئی
اسی شغل میں ہوگیا دن تمام — سمندر پہ لہرا گئی زلفِ شام
نمایاں ہوئے یک بیک بادباں — سمندر میں تھی ایک کشتی رواں
چمکتی ہوئی جگمگاتی ہوئی — ستاروں سے آنکھیں لڑاتی ہوئی
یہ دولت کی تھی کشتیٔ زرفشاں — مگر اس میں نورِ محبت کہاں
نظر آیا ایک اور اس کو جہاز — کہ تھی دوستی جس میں سرگرمِ ناز

لئے ہاتھ میں شمعِ عالم فروز　　سکھاتی تھی وہ شیوۂ سازوسوز
مگر اس میں الفت کی رنگت نہ تھی　　محبت میں اس کی حرارت نہ تھی

ہوئے بحر و بر تیرگی میں نہاں　　نہ آیا نظر پھر کوئی بادباں
ہوا روزِ امید یونہی بسر　　محبت پلٹ کر نہ آئی مگر

★ ٹامس مور (۱۷۷۹ء–۱۸۵۲ء) ڈبلن میں پیدا ہوا۔ ٹرنٹی کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد لندن آگیا۔ شخصی کشش اور شاعری کی بنا پر لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اُس کی شاعری میں موسیقی اور نغمگی کی صفت موجود ہے۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ موسیقار بھی تھا۔ کشمیر پر اُس کی نظم "لالہ رخ" جو ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئی بہت مشہور ہے۔ اردو میں یہ مثنوی "نگار" ۱۹۲۲ء میں بالاقساط شائع ہوئی۔ اس کا ترجمہ ل۔ احمد اکبرآبادی نے کیا جو بعد میں نیا کتاب گھر جامع مسجد دہلی سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

ایک گیت *[۲۱]

باغوں میں پڑے جھولے — تم بھول گئے ہم کو ہم تم کو نہیں بھولے

ساون کا مہینا ہے — ساجن سے جُدا ہو کر جینا کوئی جینا ہے

یہ رقص ستاروں کا — افسانہ کبھی سُن لو تقدیر کے ماروں کا

دل میں ہیں تمنائیں — ڈر ہے کہ کہیں ہم تم بدنام نہ ہو جائیں

اب اور نہ تڑپاؤ — یا ہم کو بلا بھیجو یا آپ چلے آؤ

آخر یہی ہونا تھا — تم کو یونہی ہنسنا تھا، ہم کو یونہی رونا تھا ٥

* "ماہیا" پنجابی زبان کا وہ نغمہ ہے جس میں شاعر کسی خارجی کیفیت کا حوالہ دے کر داخلی کیفیت بیان کرتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے اردو میں یہ تصرّف اس صنف کو منتقل کیا ہے۔

٥ یہ گیت بہت مشہور ہوا۔ اعلیٰ پائے کے استادوں نے اسے گایا۔ استاد برکت علی نے جس طرح ڈوب کر اس کو گایا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔

آخری پھول[22]*

(ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

ہو چکا موسمِ بہار آخر   نغمۂ قمری و ہزار کہاں
منتشر پتیوں کو پھولوں کی   لے گئی ہے اڑا کے بادِ خزاں

ہاں مگر ایک پھول بے چارا   نظر آتا ہے شاخ پر تنہا
اُٹھ گئے سارے ہم نفس افسوس   زندگی میں کوئی مزا نہ رہا

آؤ ڈالی سے توڑ لیں اُس کو   خاک میں اُس کی پتیوں کو ملائیں
قصۂ زیست مختصر کر دیں   اسے اندوہِ بے کسی سے چھڑائیں

دوستداری کے نور سے روشن   ہے فضائے سپہر زنگاری
دوستوں کے بغیر ہیں بے کیف   زندگی کی مسرتیں ساری

* طامس مور کی نظم "TIS THE LAST ROSE OF SUMMER" کا ترجمہ ۔ اس انگریزی نظم کا ترجمہ دس سے زائد شعراء نے کیا ہے جن میں حسرت موہانی اور سرور جہان آبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ انگریزی نظم کا متن صفحہ ۲۳۸ پر ملاحظہ فرمائیں ۔

کارخانۂ ہستی۴۳

چمک رہے ہیں فضائے سپہر میں تارے
بلندیوں پہ ہیں حُسنِ ازل کے گہوارے
زمین کے فرش پہ گل کے چراغ روشن ہیں
فروغِ جلوہ سے لالے کے داغ روشن ہیں
یہ کوہ و دشت یہ صحرا یہ وادی و گلشن
یہ مرغزار یہ دریا یہ گلستاں یہ چمن
یہ کہکشاں یہ شفق اور یہ چرخِ نیلی فام
یہ نورِ صبحِ بہار آفریں یہ جلوۂ شام
یہ مہر و مہ یہ ہجوم ثوابت و سیّار
یہ سبزہ و گل و لالہ یہ بارشِ انوار
بلندیوں پہ فضا کی یہ موجِ آب کا رقص
یہ موجِ آبِ مصفا میں ماہتاب کا رقص
ہے ایک نور سے روشن بلندی و پستی
عجیب چیز ہے یہ کارخانۂ ہستی
زمیں بھی نور سراسر فلک بھی یکسر نور
یہاں بھی جلوۂ نور، اور وہاں بھی جلوۂ طور

ایک نظم*[24]

چٹھیں لکھتے تھے جب اخبار میں ہم

تو مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

سُنا ہے کیا کہا انگور نے آلو بخارا سے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ بھینیں ، آہ یہ بھینیں

ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے جن کی جگالی کے

مرے کمرے کی تنہائی میں اکثر آنکلتی ہیں

لئے شبنم کی چادر اور کفن نرگس کے بادا کا

کہا سوسن نے مچھر سے

کہ میری روح کا نغمہ مرے صندوق میں ہوگا

میں بھول آیا ہوں گچھا چابیوں کا آج دفتر میں

جو امرت سر سے اپنے مجھ کو حصہ آپ دے دیتے

کسی کا کیا بگڑ جاتا مرا لاہور ہو جاتا ۔

* یہ نظم جب پہلی بار شائع ہوئی تو حسرت نے اشارات میں ترقی پسند شاعری پر ایک دلچسپ نوٹ لکھا ۔ جدید نظم کا مذاق اڑانے کے بعد لکھتے ہیں یہ بے قافیہ شاعری یا باصطلاحِ عام جدید شاعری بھی عجیب چیز ہے اور اگر راشد کی نظموں کو نکال دیا جائے تو اس صنف میں کام کی چیزیں بہت کم رہ جاتی ہیں آپ نے شاید اس انداز کی نظمیں پڑھی ہوں اور نہ پڑھی ہوں تو راقم الحروف کے چند اشعار سن لیجیے ۔ آپ کو اس جدید صنفِ سخن کے متعلق اندازہ ہو جائے گا"۔

سڑک [۲۵]

یہ سڑک

سامنے یہ جو ہے کچی سی سڑک

جس پہ استادہ ہیں شیشم کے درخت

بالکل صف بستہ

پاسبانوں کی طرح

یہ سڑک

یہ سڑک صاف بھی ہے سیدھی بھی

نہ کوئی پھیر نہ موڑ

نہ پیچ نہ خم

اور نہ خاشاک کے انبار کہیں

یہ سڑک

یہ سڑک جس پہ جوانانِ حسیں محوِ خرام

کاجل آنکھوں میں ہے۔ کاجل میں نشے کے ڈورے

تمتمائے ہوئے گال

بال بکھرے ہوئے بہکی ہوئی چال

اور کلوں میں دبائے ہوئے پان

یہ سڑک ——

یہ سڑک خام سہی

شارعِ عام سہی

پھر بھی یہ بات بڑی ہے کہ چلی جاتی ہے۔

اپنی ہی دُھن میں چلی جاتی ہے

یوں ہی کلکتے سے لاہور تلک

یہ سڑک ــــــــ

کبھی تنہائی سے گھبرا کے نکل آتا ہوں

اس سڑک پہ جو ٹہلنے کے لئے

یک بیک

ذہن بن جاتا ہے میرا بھی سڑک کے مانند

ایک ایسی سڑک کے مانند

جو چلی جاتی ہے کلکتے سے لاہور تلک

اس پہ افکار جواں

مثل حورانِ حسیں محوِ خرام

اور اشعار رواں

کار کی طرح رواں دواں

گرد میں جس کی چھپی جاتی ہے

شعلۂ رُخ کی لپک

شور میں جس کے دبی جاتی ہے

ایک چوڑی کی کھنک

یہ سڑک ــــــــ

سامنے یہ جو ہے کچی سی سڑک

جس پہ استادہ ہیں شیشم کے درخت

بالکل صف بستہ

پاسبانوں کی طرح

یہ سڑک ــــــــ

★ نظم کے بارے میں حسرت نے لکھا ہے "یہ نظم پوری طرح بے قافیہ نہیں بلکہ کہیں کہیں قافیہ بھی آگیا ہے۔ پھر بھی اکثر لوگوں کو اس لئے پسند ہے کہ سڑک چاہے کچی ہو یا پکی آخر کام کی چیز ہے"۔ "مضامینِ حسرت" شیرازہ پبلشرز۔ لاہور ۱۹۵۶۔ ص۔ ۹۶

مسعود کی شادی پر[٣٦] *

خبر لے کے آئی ہے بادِ بہار — کہ مسعود صاحب بیاہے گئے

وہ کوئے محبت میں پہلے پہل — یہ سچ ہے فقط گاہے گاہے گئے

مگر آخرِ کار پکڑے گئے — لگے چاہنے اور چاہے گئے

ادائیں دلوں کو پسند آگئیں — سب اطوار اُن کے سراہے گئے

نگاہیں اُگاہی بھی کرتی رہیں — دلوں میں کئی دِل اُگاہے گئے

جو بوسہ تھا باقی الگ ہوگیا — رہِ عشق میں ایسے گاہے گئے

بڑی دھوم اور باجے گاجے کے ساتھ — نکالے گئے اور بیاہے گئے

محبت کے رشتے نے جکڑا اُنہیں
گواہی کو ہم سے بُلاہے گئے

* کرنل مسعود احمد ۱۹۱۴ء میں کولو تارڑ (تحصیل حافظ آباد) میں پیدا ہوئے۔ فوج میں پبلک ریلیشنز افسر رہے۔ ۱۹۶۸ء میں ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ "قلم اور کوڑے" روزنامہ 'مشرق' میں شائع ہونے والے کالموں کا مجموعہ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۸ء سے روزنامہ 'مسلم' میں 'ROVING EYE' کے عنوان سے کالم لکھ رہے ہیں۔

قطعۂ تاریخ *

ہنگامِ سحر شاعرِ شیریں گفتار   حیرت میں تھا سُن کے شورِ دمامہ و کوس

اتنے میں ہاتفِ غیب سے صدا آئی کہ "آج   مسعود سے نوشہ بنتِ داؤد عروس"

۱۳۶۵ھ

زندگی گزرے گی اب تو چین سے   بندھ گئی مسعود کی دُم زین سے

* کرنل مسعود کی شادی کا قطعۂ تاریخ ۔ عیسوی سن ۱۹۴۶ بنتا ہے .

جنگ نامۂ وزارت[۲۷]

بدہ ساقی آں مے کہ تا دم زنیم — قلم بر سرِ ہر دو عالم زنیم *

مجھے بادۂ مشکبو کر الاٹ — مئے ارغواں کا سبو کر الاٹ

پلا ساقیا آبِ آتش لباس — کہ مُلّائے مسجد کے گم ہوں حواس

عسس سے نہ ڈر محتسب سے نہ ڈر — ہیں دونوں پڑے مست اور بے خبر

ہیں مفتی و شیخ اور پیر و وزیر — کمندِ ہوا و ہوس کے اسیر

ہے واعظ امارت کے خوابوں میں گم — تموّل کے زریں سرابوں میں گم

فقیہوں کو ہے کارخانوں کی فکر — دوکانوں کی فکر اور مکانوں کی فکر

پلا ساقیا آبِ یاقوت رنگ — کہ اربابِ دولت ہیں مصروفِ جنگ

حباباتِ مستی اٹھا کر پلا — نگاہوں کی مستی اٹھا کر پلا

اِدھر اہلِ مسجد اُدھر اہلِ دیر — سبھی دیکھتے ہیں لڑائی کی سیر

سبک باش و رطلِ گرانم بدہ — اگر فاش نتواں نہانم بدہ o

ہوس نے ہے چھیڑا تباہی کا راگ — گرجتی ہیں توپیں برستی ہے آگ

ادھر دولتانہ شہِ جم سپاہ — سپہدارِ گردانِ زریں کلاہ

لئے ساتھ حیلوں بہانوں کی فوج — وہ وعدوں کے لشکر فسانوں کی فوج

غرورِ رشیدی سے نظر تابناک — مگر دامنِ آگہی چاک چاک

وہ فیروز خاں نون مردِ جری — نگاہوں میں ہے جس کی افسوں گری

جسے یاد ہیں سب لڑائی کے ڈھنگ — لڑائی کے جنگ آزمائی کے ڈھنگ

کرامت علی گردِ لشکر شکن — جسے مانتے ہیں سب اربابِ فن

* حافظ شیرازیؒ کے "ساقی نامے" کے تیسرے بند کا پہلا شعر ہے۔

o حافظ شیرازیؒ کے "ساقی نامے" کے تیسرے بند کا دوسرا شعر ہے۔

سیال اور چٹھے لسال اور کھرل　　چلے رزم گاہ کی طرف دل کے دل

لئے پلٹنیں اور رسالے چلے　　کئی ساتھ اخبار والے چلے

چلے اور پرچم اڑاتے چلے　　ستاروں سے آنکھیں لڑاتے چلے

کوئی ان میں لندھور کی یادگار　　کوئی رستم اور کوئی اسفند یار

کوئی اس میں پوتا ہے کاؤس کا　　بھتیجا سگا ہے کوئی طوس کا

ادھر خان ممدوٹ مردِ دلیر　　وزارت کے بیشے کا غرندہ شیر

شجاعت میں یکتا شیامت میں فرد　　بڑھے جانبِ عرصہ گاہِ نبرد

چلا ساتھ اس کے وہ گرگِ کہن　　نیل نام اور محمد حسن

لئے ساتھ ملتان کے گھڑ چڑھے　　مبارک علی اور دستی بڑھے

کسی سمت سے پاندانوں کی فوج　　کسی سمت رنگیں بیانوں کی فوج

چلیں حرص کی پلٹنیں پیش و پس　　ادھر بھی ہوس اور اُدھر بھی ہوس

سپے کاندھے پہ ہرچند گرزِ گراں　　دعاؤں میں مصروف لیکن زباں

جو مل جائے یارب کوئی فیکٹری　　مری بھی ہو کشتِ تمنا ہری

وزارت ملے یا صدارت ملے　　کوئی سال بھر تجارت ملے

الٰہی مجھے سکتر بنا　　"کریما بہ بخشائے بر حالِ ما" *

ہوا گرم ہنگامۂ کارزار　　نظر آئی دشوار راہِ فرار

* شیخ سعدیؒ کی "کریما" کا مصرع ہے۔ دوسرا مصرع "کہ ہستم اسیرِ کمند ہوا"

وہ گالی کے چھرّے وہ طعنوں کے تیر گئے اُن کی آن میں دل کو چیر

"کمند از دو کمّے مسلسل شکنج دہن باز کردہ بہ تاراج گنج"★

بڑا لطف اس کا تھا پالی میں تھا مزا کرسیوں کی لڑائی میں تھا

لڑی برطھ کے جاگیر ، جاگیر سے لیا کام نیزے کا تدبیر سے

اُدھر خوب کرسی سے کرسی لڑی مری سمت سے کس میں کسی لڑی

بڑھے دونوں جانب سے آتش بیاں بیانوں کی توپوں نے باندھا سماں

بہت خوب اخبار والے لڑے مقالے سے بڑھ کر مقالے لڑے

نہ پانی گھڑے میں نہ چولھے میں آگ مگر خوب کھیلے لنگوٹی میں پھاگ

پلا ساقیا بادۂ لعل فام لنڈھا دے مئے ارغوانی کے جام

مئے احمریں سے کھلا دے چمن بیادِ شہیدانِ خونیں کفن

ہوا ختم جاگیرداری کا دور ٹوانے کا دور اور لغاری کا دور

اُٹھو اور ان سے تیغ و سنا چھین لے یہ دونوں کے گرزِ گراں چھین لے

مرا دور ہے اور ترا دور ہے

زمیں اور ہے ، آسماں اور ہے

★ نظامی گنجوی کی مثنوی 'اسکندر نامہ' کا شعر ہے ۔ نظامی کا پورا نام حکیم جمال الدین ابو محمد الیاس بن یوسف نظامی ہے ۔ (۱۱۴۰ - ۱۲۲۷) نظامی کے معاصر کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کی پانچ مثنویاں ہیں جنہیں خمسہ یا پنج گنج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ کئی بڑے شعراء نے خمسہ کا جواب لکھنے کی کوشش کی ہے جیسے جامی ، امیر خسرو ، فیضی وغیرہ ۔ میر تقی میر نے اپنے ایک شعر میں خمسہ کی طرف خوب اشارا کیا ہے ۔

؎ میرؔ ہی فکریں پریشاں میر یاروں کی ۔ حواسِ خمسہ کرے جمع سو نظامی ہے

چھیڑ اچھی نہیں لوہاروں سے[٢٨] *

شاعری آپ کی نہیں جاگیر — شعر فتّو لوہار کیوں نہ کہے
ذکرِ صبحِ بہار کیوں نہ کرے — اُسے صبحِ بہار کیوں نہ کہے
خمِ کاکل حال کیوں نہ لکھے — زلف کو تابدار کیوں نہ کہے
قلب ہے داغدار سینے میں — قلب کو داغدار کیوں نہ کہے
موج ہے بے قرار دریا میں — موج کو بے قرار کیوں نہ کہے
ہے کفِ خاک اگر غبار انگیز — اُسے مُشتِ غبار کیوں نہ کہے
لبِ لعلیں یار کو آخر — لبِ لعلیں یار کیوں نہ کہے
غیر نے راستہ جو ڈھونڈا ہے — اُسے راہِ فرار کیوں نہ کہے

کیوں الجھتے ہو دل فگاروں سے
چھیڑ اچھی نہیں لوہاروں سے

* یہ نظم ۲۹ نومبر ۱۹۴۹ء کو روزنامہ 'امروز' میں شائع ہوئی۔ حسرت و تاثیر کا معرکہ جو 'امروز' اور 'مغربی پاکستان' میں جاری رہا، بعد میں 'نقوش' ادبی معرکے نمبر میں بحوالہ 'چٹان' شائع ہوا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب راقم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:
"حسرت اور تاثیر کے درمیان جو اختلاف ہوا اس کا بنیادی سبب ترقی پسند مصنفین کی وہ یادگار کل پاکستان کانفرنس تھی جو نومبر ۱۹۴۹ء میں لاہور کے اوپن ایئر تھیٹر میں منعقد ہوئی تھی۔ ان دنوں حسرت صاحب روزنامہ امروز کے مدیر تھے۔ وہ کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے اس لئے خطبۂ استقبالیہ انہی نے پڑھا اس خطبے میں جہاں لاہور کی تاریخی اور تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کا ذکر تھا وہیں ترقی پسند مصنفین کے حق میں چند کلمہ اُنسے ظاہر کیے گئے تھے۔ ان دنوں تاثیر صاحب، جو ترقی پسند مصنفین کے راہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، کسی وجہ سے انجمن سے خفا تھے سو انہیں اور ان کے ساتھیوں (شورش کاشمیری، سیف الدین سیف) کو حسرت کی یہ ادا پسند نہ آئی اور انہوں نے روزنامہ 'مغربی پاکستان' میں شعروں کے ذریعے حسرت پر حملہ کر دیا۔" اور یوں یہ معرکہ شروع ہو گیا۔ بقول سید ضمیر جعفری مذکورہ بالا نظم حسرت کی فکر کا نتیجہ ہے۔ باقی نظمیں سامنے کی ہیں۔

حرف و حکایت ۲۹

ووٹ کی چوٹ دل نے کھائی ہے
خان ممدوٹ کی دُہائی ہے
لپاڈگی ہے کہ ہتھا پائی ہے
"شوق سے بات۔ کیا بڑائی ہے"
باری و دولتانہ و ممدوٹ
ایک سے ایک کی لڑائی ہے
کرسیاں کرسیوں سے لڑتی ہیں
رات دن زور آزمائی ہے
دھینگا مشتی میں گاؤ زوری ہیں
قوم کی کوئی تو بھلائی ہے
وہی لیڈر ہے اس زمانے میں
کہ تھ ہیں جس کے زیر پائی ہے
آبرومند ہے وہی جس نے
آبرو ووٹ سے بچائی ہے
اینڈتا ہے اکڑ کے چلتا ہے
اور باری میں کیا بُرائی ہے

میاں ممتاز کی خُدائی بھی
میاں نمرود کی خُدائی ہے
لیڈری ہے کہ مُرغ بازی ہے
رہزنی ہے کہ راہ نمائی ہے
الفراق، الفراق اے کرسی
آج پہلی شب جدائی ہے
وہی شیخوپورہ کی گلیاں ہیں
وہی اپنی شکستہ پائی ہے

چنا جور گرم* ۳۰

میرا چنا ہے سب سے نیارا   جس کو کھائے عالم سارا

منشی، متصدی، پٹواری   گماشتہ، عبدالباری

چنا جور گرم

میرے چنے کا ڈھنگ نرالا   اس کو کھائے قسمت والا

اس کے گاہک کُرتے والے   یعنی ہپ ہپ ہُرے والے

سارے مہاجر، انصاری   چیمہ، لڈن، عبدالباری

چنا جور گرم

* میاں ممتاز دولتانہ اور میاں عبدالباری یکے بعد دیگرے صوبہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے تو یہ گیت لکھا۔

منظوم رسید*[31]

ہمیں آج پیروں سے شالی ملی ہے
زمانہ سے لیکن نرالی ملی ہے
نہیں دھان میں ایک چاول کا دانہ
صراحی ملی ہے پہ خالی ملی ہے
"سنھو کنھو وتھرن" زمستاں جھوا یوں °
کہ شالی میں آدھی پلالی× ملی ہے
لگائینگے حسرت ہم آنکھوں پہ اُن کو
نقابِ حسیناں کی جالی ملی ہے

* ریاست پونچھ کے سیاسی لیڈر، سیاسی پیر اور جاگیردار پیر حسام الدین کی طرف سے شالی دھان کا تحفہ وصول ہونے پر یہ نظم لکھی گئی۔ غلط فہمی کی بنا پر نئی شالی کی بجائے آپ کو پرانی شالی بھیج دی گئی۔ جو کرم خوردہ تھی۔ شالی میں پلالی (پرالی) تھی، شالی کے دانوں میں سوراخ تھے۔ دھان لانے والے نے رسید مانگی تو حسرت نے فی البدیہہ یہ رسید لکھ دی۔

° کشمیری زبان کا مصرع ہے۔ "اُٹھو بستر بچھا جاڑے کی آمد آمد ہے" اس مصرع کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ تم بات پھیلا رہے ہو، سردی آرہی ہے اور کچھ ذخیرہ کرلو۔ حسرت پونچھ (کھوئی رٹہ) کے رہنے والے تھے وہاں کشمیری زبان مختلف ہے اگر وہ کشمیری زبان جاننے والے ہوتے تو زمستاں کے بجائے "وندہ" کا لفظ لاتے جو کشمیری زبان میں جاڑے کے معنوں میں آتا ہے۔

× پلالی سے مراد پرالی ہے یعنی چاول کا چھلکا۔

یونی نسٹ پارٹی* کی شان میں

چند ٹپّے ۳۲

تیرے گورے گورے گال — اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال — اتحاد پارٹی
تیرا یار نریندر ناتھ — اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ — اتحاد پارٹی ٥

* پنجاب یونی نسٹ (اتحاد پارٹی) کی بنیاد ۱۹۲۳ میں رکھی گئی۔ میاں فضل حسین اس کے بانی تھے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں پارٹی تقریباً ختم ہو گئی۔

٥ جس زمانے میں چراغ حسن حسرتؔ روزنامہ 'احسان' میں مطائبات کا کالم لکھتے تھے، اُن کا قلم سراپا بہار اور طنز بے پناہ تھی۔ جس عنوان کو چھو لیتے وہی زندۂ جاوید بن جاتا۔ ۱۹۳۵ء کے دستور کے تحت پنجاب میں پہلا انتخاب ہونے والا تھا اور صوبہ بھر کی فضا میں اضطراب اور کشمکش کی ایک لہر جاری تھی۔ اتحاد پارٹی کی گڈّی چڑھی ہوئی تھی اور سر سکندر حیات کا نصیبہ عروج پر تھا۔ ادھر مسلم لیگ کی حالت خستہ اور کمزور تھی۔ روزنامہ 'انقلاب' اُن دنوں اتحاد پارٹی کا سب سے بڑا نقیب اور 'احسان' لیگ کا طرفدار تھا۔ 'انقلاب' کے افکار و حوادث میں آئے دن لیگ کی بے سروسامانی پر طعن و تشنیع کے نشتر چلائے جاتے تھے۔ ایک دن مدیر افکار نے اپنے کالم میں سوال و جواب کے طور سے ایک مختصر سا مکالمہ لکھ کر اتحاد پارٹی کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی وہ مکالمہ یوں تھا:

پنجاب میں سب سے بڑی سیاسی جماعت کون سی ہے؟ ...... اتحاد پارٹی
پنجاب میں سب سے زیادہ مسلمان کس پارٹی میں شامل ہیں؟ ...... اتحاد پارٹی
پنجاب میں کس پارٹی نے عوام کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے؟ ...... اتحاد پارٹی

حسرتؔ نے دوسرے ہی روز 'احسان' میں لکھا کہ حضرت یوں بات نہیں بنے گی چاہیے تو یہ کہ دو آدمی ہاتھوں میں لمبے لمبے چھڑے پکڑ کر سڑک کے آر پار کھڑے ہو جائیں ان میں سے ایک اپنا چھڑا بجاتا ہوا پکارے تیرے گورے گورے گال۔ دوسرا بلند آواز میں جواب دے۔ اتحاد پارٹی۔ یہ مکالمہ چند ہی روز میں لاہور کے گلی کوچوں میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔

حوالہ جات

۱۔ آفتاب، کلکتہ، جنوری ۱۹۲۶ء ص ۴۷

۲۔ ایضاً ص ۳۸

۳۔ ایضاً فروری ۱۹۲۶ء ص ۱۶

۴۔ ایضاً ص ۳۵

۵۔ ایضاً ص ۵۸

۶۔ ایضاً اگست ۱۹۲۶ء ص ۳۳-۳۴

۷۔ ایضاً مئی ۱۹۲۷ء ص ۴۶

۸۔ ۱۹۳۰ء

۹۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۵ جولائی ۱۹۳۰ء

۱۰۔ ایضاً ۴ جولائی ۱۹۳۱ء

۱۱۔ ایضاً ۳ ستمبر ۱۹۳۲ء

۱۲۔ ایضاً ۱ جولائی ۱۹۳۳ء

۱۳۔ ایضاً ۱ جولائی ۱۹۳۳ء

۱۴۔ اختر، لاہور ستمبر ۱۹۳۴ء
شیرازہ، لاہور ۸ فروری ۱۹۳۷ء

۱۵۔ روزنامہ احسان، لاہور ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء

۱۶۔ شیرازہ، لاہور، ۱۰ دسمبر ۱۹۳۶ء

۱۷۔ ایضاً ۱۶ دسمبر ۱۹۳۶ء

۱۸۔ ایضاً ۱۹۳۷ء

۱۹۔ روزنامہ احسان، لاہور ۳ جون ۱۹۳۷ء

۲۰۔ شیرازہ، لاہور، ۲۴ جولائی ۱۹۳۷ء

ادبی دنیا، لاہور، اگست ۱۹۳۷ء

۲۱۔ شیرازہ، لاہور، ۲۴ جولائی ۱۹۳۷ء

۲۲۔ ایضاً ۱۵ اگست ۱۹۳۷ء

۲۳۔ ایضاً ۳۰ مارچ ۱۹۳۹ء

۲۴۔ ایضاً ۱ ستمبر ۱۹۴۰ء

۲۵۔ نئی صدی، دہلی۔ ۱۹۴۰ء

۲۶۔ ۱۹۴۶ء

۲۷۔ روزنامہ امروز، لاہور ۲۶ جون ۱۹۴۹ء

۲۸۔ امروز، لاہور ۲۹ نومبر ۱۹۴۹ء

۲۹۔ امروز، لاہور ۱۲ اگست ۱۹۵۰ء

۳۰۔ امروز، لاہور ۸ ستمبر ۱۹۵۰ء

۳۱۔ روزنامہ تعمیر، راولپنڈی ۹ جولائی ۱۹۵۵ء

۳۲۔ نورتن۔ شورش کاشمیری، لاہور۔ مطبوعات چٹان ۱۹۶۷ء ص ۱۰۰

سال گرہ ۱

پھول* کی سال گرہ ہے آج   خوشیوں کا پیغام ہے لائی

دیکھو قدرت کی گلکاری   ڈالی ڈالی کیاری کیاری

پتے ہیں کہ جھوم رہے ہیں   منہ پھولوں کا چوم رہے ہیں

کلیاں چٹکیں جنگل مہکے   کوئل کوکی بلبل چہکے

ننھے ننھے بچے سارے   مل کر ہم آواز پکارے

سال گرہ ہے سال گرہ ، پیارے پھول کی سال گرہ

اچھے پھول کی سال گرہ ، سال گرہ ہے سال گرہ

سال گرہ کا دن آیا ہے   کیسا اچھا دن آیا ہے

ننھے ننھے لڑکے بالے   پیارے پیارے بھولے بھالے

سال گرہ نمبر کو لے کر   خوش پھرتے ہیں اندر باہر

ہم خوش ہیں تو دنیا خوش ہے   اماں خوش ہے بابا خوش ہے

تصویریں ہیں دکھاتے جاتے   اور مل کر ہیں گاتے جاتے

سال گرہ ہے ، سال گرہ ، پیارے پھول کی سال گرہ

اچھے پھول کی سال گرہ ، سال گرہ ہے سال گرہ

* ہفتہ وار بچوں کا رسالہ 'پھول' جو مولوی سید ممتاز علی نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لاہور سے جاری کیا۔ یہ رسالہ ۱۹۵۷ء تک پورے اڑتالیس برس باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ یہ ایک معیاری رسالہ تھا جس نے بچوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

راوی کے کنارے[۲]

چل دیکھو نظارے چھٹکے ہوئے تارے
اور نور کے دھارے راوی کے کنارے

اُٹھی ہے سیہ رات پہنے ہوئے بانات
زلفوں کو سنوارے راوی کے کنارے

کرتی ہے ہوا سے گھنگھور گھٹا سے
کچھ برق اشارے راوی کے کنارے

مینہ کا تھا زور جھنگارتے ہیں مور
پنکھ اپنے پسارے راوی کے کنارے

جگنو ہیں چمکتے ہیرے ہیں دمکتے
اُڑتے ہیں شرارے راوی کے کنارے

ستاروں کی نیند ۳

سحر نور دنیا میں پھیلا رہی ہے — صبا آ کے باغوں کو مہکا رہی ہے

بجاتا ہے دریا اُدھر شادیانے — اِدھر بلبلیں ہیں سُناتی ترانے

بڑھائی ہیں سورج نے کرنوں کی فوجیں — اُٹھیں ہو کے بے تاب راوی کی موجیں

ہوا کی پری پنکھیا جھل رہی ہے — کلی جاگ کر انکھڑیاں مل رہی ہے

کرن مسکراتی ہوئی گا رہی ہے

کہ ننھے ستاروں کو نیند آ رہی ہے

اجالے سے ڈر کر جو بھاگا اندھیرا — شعاعوں نے دنیا پہ رنگ اپنا پھیرا

بڑھیں اور نہروں کو بڑھ کر جگایا — گلستاں میں پتوں کا کندھا ہلایا

درختوں کو بخشے سنہری دوشالے — بھرے نور سے سُرخ پھولوں کے پیالے

یہ کیا کہہ دیا صبح نے کہکشاں سے — کہ ڈیرا اٹھا کر چلی آسماں سے

یہی گیت گاتی چلی جا رہی ہے

کہ ننھے ستاروں کو نیند آ رہی ہے

راز کی باتیں؎

نہ کوئی چال اور نہ کوئی گھات — نہ کوئی مکر اور فریب کی بات

نہ کوئی دشمنی نہ کوئی عناد — نہ عداوت نہ نیتوں کا فساد

نہ کوئی مال وزر کا قصّہ ہے — نہ کسی شور و شر کا قصّہ ہے

ننھی ہیں راز کی باتیں — سوز کی اور ساز کی باتیں

رنج کی اور ملال کی باتیں — خواب کی اور خیال کی باتیں

گیت ننھا ہے ساز بھی ننھا — دل بھی ننھا ہے راز بھی ننھا

ننھے ننھے کچھ فسانے ہیں — کچھ نئے اور کچھ پرانے ہیں

چھوٹے ماموں جو آ رہے آئیں گے — اچھے اچھے کھلونے لائیں گے

ساتھ میلے میں لے کے جائیں گے — سب تماشے ہمیں دکھائیں گے

پھر تو بیٹھیں گے ہم ہنڈولے پر — اور چڑھیں گے اڑن کھٹولے پر

سائیکل ایک ہم کو لادیں گے — اور موٹر بھی اک منگادیں گے

کل جو بجیا نے ہم کو مارا تھا — کس کا غصّہ کہاں اتارا تھا

بی حمیدہ کی شامت آئی ہے — چغلی ابا سے جا کے کھائی ہے

اب کے گڑیا بھی چھین لیں گے ہم

چھین لیں گے تو پھر نہ دیں گے ہم ٭

؎ یہ نظم 'تہذیب نسواں' کے علاوہ 'پھول' لاہور میں بھی شائع ہوئی۔ 'پھول' کے شمارے میں تیسرا اور چوتھا شعر نہیں ہے۔

ساتویں شعر کے پہلے مصرعے میں دو بار 'ننھے' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

ننھے تارے ٥

اچھی امی یہ آسماں کیا ہے ؟ چاند کیا شے ہے کہکشاں کیا ہے ؟

ننھے تارے کہاں سے آتے ہیں ؟ خوف سے کس کے تھرتھراتے ہیں ؟

کون سے مدرسے میں پڑھتے ہیں ؟ کس طرح آسماں پہ چڑھتے ہیں ؟

ہے کہیں آسماں زمیں ہے کہیں کوئی زینہ بھی تو نہیں ہے کہیں

کھیلتے ہیں نہ گیت گاتے ہیں یوں ہی چپ چاپ مسکراتے ہیں

چپکے چپکے اشارے کرتے ہیں کیا یہی کام تارے کرتے ہیں

سوتے ہیں کس طرح یہ متوالے اوڑھ کر بادلوں کے دوشالے

میں تو اکثر انہیں بلاتی ہوں نت نئے گیت بھی سناتی ہوں

وہ بھلا کب جواب دیتے ہیں ہاں کنکھیوں سے دیکھ لیتے ہیں

اے ہے امی ابھی سے سو بھی گئیں

نیند میں اتنی جلدی کھو بھی گئیں

آؤ ہم بن جائیں تارے [6]

(ایک گیت)

آؤ ہم بن جائیں تارے
ننھے ننھے پیارے پیارے

دھرتی سے آکاش پہ جائیں
چمکیں دمکیں ناچیں گائیں

بادل آئے دھوم مچاتے
لے کر کالے کالے چھاتے

آؤ ہم بھی دھوم مچائیں
اُن کے پردوں میں چھپ جائیں

آؤ آنکھ مچولی کھیلیں
مل کر سب ہمجولی کھیلیں

لو شفق گلزار کا پھولا
ڈالا آ کے دھنک نے جھولا

آؤ جھولیں اور جھلائیں
اُن کے رنگ اتار کے لائیں

پھر اُن رنگوں سے پچکاری
بھر لیں اپنی باری باری

آؤ کھیلیں ہولی کھیلیں
مل کر سب ہمجولی کھیلیں

پہلا سبق*

ننھی پڑھنے آئی ہے
شیرینی بھی لائی ہے

ننھا دل اور ننھا سن
اور اسکول کا پہلا دن

پریوں جیسی صورت ہے
کیسی موہنی مورت ہے

کتنی بھولی بھالی ہے
دل مکروں سے خالی ہے

نقشہ ہے اسکول کا اور
یاد آتے ہیں گھر کے طور

استانی جب جاتی ہیں
لڑکیاں شور مچاتی ہیں

چھینا چھپٹی ہوتی ہے
اک ہنستی اک روتی ہے

سب آپس میں لڑتی ہیں
لڑتی اور جھگڑتی ہیں

استانی جی جب آئیں گی
اور سب خاموش* ہو جائیں گی

★ 'پھول' کے انتخاب میں لفظ 'چپ' لکھا گیا ہے۔

ننھی کو وہ بُلائیں گی
باتیں نئی سکھائیں گی*

یہ ہے الف اور یہ ہے بے
یہ ہے پے اور یہ ہے تے

گھر کی یاد ستاتی ہے
جی میں ہمی جاتی ہے

* "اخبار پھول کی ۸۱ سال کی جلدوں کا انتخاب" میں مصرعہ یوں نئی بات سکھائیں گی۔ درج ہے۔

ماں کا دُلارا ^

یہ ہے میری آنکھ کا تارا — بھولا بھالا پیارا پیارا
ساری آس مرادیں اُس سے — جی اماں کا شاد ہے اُس سے

وہ دن جلد الٰہی آئے — میٹھے میٹھے بول سنائے
پاؤں پاؤں چلنا سیکھے — کُودنا اور اُچھلنا سیکھے

وہ دن جلد الٰہی آئے — بستہ لے کر مدرسے جائے
لکھنا سیکھے، پڑھنا سیکھے — علم کی راہ میں بڑھنا سیکھے

وہ دن جلد الٰہی آئے — اُونچے اونچے رتبے پائے
مُلک کی خدمت کرنا سیکھے — سیوا کا دم بھرنا سیکھے

وہ دن جلد الٰہی آئے — چاند سی بنّو بیاہ کے لائے
جُگ جُگ جیئے پھلے اور پھولے — خوشیوں کے جھولوں میں جھولے

خوجی کا بھائی ؟

کیوں رے بھیّا اینٹھے خان　　تم ہو بہت بڑے بلوان

ہم کو ڈنڈ دکھاتے ہو　　مفت میں اینٹھے جاتے ہو

خوخو خوخو کرتے ہو　　لیکن جی میں ڈرتے ہو

ایک ہی گدّا کھاؤ گے　　روتے گھر کو جاؤ گے

ایک کو ابھی پچھاڑا ہے　　مارا اور لتاڑا ہے

نوچ لئے ہیں سارے پر　　روتا ہوا گیا ہے گھر

نوچا اور کھسوٹا ہے　　تڑپا ہے اور لوٹا ہے

یوں ہی وہ بھی اکڑتا ہے　　سر مُرغے سے لڑتا ہے

شامت آپ کی آئی ہے　　موت ہی کھینچ کے لائی ہے

تم کو ناچ نچاؤں گا　　کچّا ہی کھا جاؤں گا

بندر ہے سُن کر حیران　　یہ باتیں ، یہ ننھی جان

پاگل ہے سودائی ہے　　یا خوجی کا بھائی ہے

پنجاب کے میدان ۱۰

رکھتے ہیں عجب شان
پنجاب کے میدان

ہر سمت بہاریں
ہر سمت نظارے
پیڑوں کی قطاریں
چشموں کے کنارے
ڈھوروں کو چراتے
پھرتے ہیں گوالے
صحراؤں میں گاتے
پھرتے ہیں گوالے
پربت کہیں ٹیلے
جنگل میں کہیں بن
جھیلیں کہیں چشمے
صحرا کہیں گلشن
آکاش سے اونچا
کچھ پایہ ہے اُن کا
اور کوہِ ہمالہ
ہمسایہ ہے اُن کا

رکھتے ہیں عجب شان
پنجاب کے میدان

گھنگھور گھٹائیں
کیا چھائی ہوئی ہیں
اور سرد ہوائیں
لہرائی ہوئی ہیں
مینہ اور ہوا نے
غلّے سے بھرے کھیت
کتنے ہیں سہانے
زرد اور ہرے کھیت
دھرتی کے جگر سے
دریا ہیں بہائے
اور اُن کے کنارے
گلزار کھلائے
میدانوں میں ہر جا
نہریں ہیں کہیں تال
اور پانچ یہ دریا
پنجاب کے ہیں لال

رکھتے ہیں عجب شان
پنجاب کے میدان

ننھی اور بُلبل

بُلبل پیاری پیاری بُلبل
باغ کی راج دُلاری بُلبل

میٹھے گیت سنانے والی
کیاری کیاری گانے والی

کتنے پیارے بول ہیں تیرے
گانے سب انمول ہیں تیرے

یہ تیرا چہکارے بھرنا
پھول سے دل کی باتیں کرنا

پیڑ پہ بیٹھنا اور اُڑ جانا
گا کر اُڑنا اُڑ کر گانا

کیا کہوں دل کو بھایا کیسا
تو نے جی کو لُبھایا کیسا

اُڑ کر پیڑ سے آجا بُلبل
مجھ کو گیت سُنا جا بُلبل

گھر اپنے لے جاؤں گی میں
تجھ کو ساتھ سلاؤں گی میں

اچھے اچھے کھلونے دوں گی
گڑیا بھی تجھ کو دے دوں گی

آ بینڈ کھلیا مل کے لگائیں
ناچیں کودیں، کھیلیں گائیں

بھیا جب اسکول سے آئیں
تجھ کو دیکھ کے خوش ہو جائیں

حوالہ جات

۱۔ پھول، لاہور ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء

۲۔ پھول، لاہور ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء

۳۔ پھول، لاہور ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء

۴۔ تہذیب نسواں، لاہور ۲ جولائی ۱۹۳۲ء

۵۔ پھول، لاہور ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء

۶۔ ایضاً ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء

۷۔ ایضاً ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء

۸۔ ایضاً ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء

۹۔ ایضاً ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء

باب پنجم

جائزہ

حسرت کی غزل کا جائزہ

چراغ حسن حسرت نے بچپن ہی سے شاعرانہ مزاج پایا تھا گھر کے علمی و ادبی ماحول نے اُن کے شوق کو مہمیز دی۔ طالب علمی کے زمانے کے اشعار سے اُن کی شاعرانہ افتاد کا پتہ چلتا ہے۔ کلاسیکی ادب کے گہرے مطالعے اور ذوق نے مستقبل میں شعر و ادب کی راہیں ہموار کر دیں۔ درس و تدریس کے مختصر دور کے بعد جب انہوں نے صحافتی زندگی میں قدم رکھا تو ایسے لوگوں کی ہمراہی میسر آئی جو شعر و ادب کے دلدادہ اور شیفتہ و فریفتہ تھے، لیکن اخبار نویسی کے جھمیلوں میں وہ اس حد تک منہمک رہے کہ شاعری کی طرف یکسوئی سے توجہ نہ دے سکے۔ اور جو کچھ شاعری کے میدان میں انہوں نے تخلیق کیا وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ ویسے بھی شعری تخلیقات کم تھیں اور کچھ دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ نثر و نظم دونوں اُن کے میدان تھے، لیکن نثر کو زیادہ تر اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

چراغ حسن حسرت نے 'امروز' اور 'نوائے وقت' سے پہلے جن اخبارات و رسائل میں لکھا جیسے 'نئی دنیا' (کلکتہ)، 'عصرِ جدید' (کلکتہ) وغیرہ کے ذخیرے کا پتہ نہیں چلتا اگر کہیں اُس کا سراغ ملتا بھی ہے تو وہ دسترس سے باہر ہے۔ قیامِ کلکتہ کے دوران میں حسرت نے جنوری ۱۹۲۶ء میں ماہوار ادبی رسالہ 'آفتاب' جاری کیا۔ اُن کی سب سے پرانی غزلیں اسی رسالہ میں شائع ہوئیں۔ 'احسان' لاہور کی فائیلیں کہیں موجود نہیں°۔ اس اخبار میں حسرت کی شعری تخلیقات منظرِ عام پر آتی رہیں۔ پنجاب حکومت کے 'ہفت روزہ' میں فرضی ناموں سے غزلیں اور نظمیں بھی لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ زمیندار، انصاف، شہباز اور احرار وغیرہ سے بھی منسلک رہے۔

"وہ زمیندار اور انصاف کے زمانہ میں سیاسی نظمیں بھی کہی تھیں لیکن اب ناپید ہیں۔"[۱]

° اس اخبار کی دو تین فائیلیں نظر سے گزری ہیں۔ وہ کرم خوردہ اور ناقابلِ استعمال ہیں۔

اس کے علاوہ 'پھول' اور 'تہذیبِ نسواں'٭ میں اُن کی نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ 'جوان' ستّار کے حسرت مدیر تھے۔ اس میں بھی اُن کی نگارشات شائع ہوئیں جو دسترس میں نہیں۔ 'جوان' کی ایک نظم کا حوالہ حسرت کے ہم کار اور دوست کرنل مسعود صاحب نے ایک گفتگو میں دیا۔ اس نظم کے دو شعر ہیں۔

جھوٹ کی پوٹ ہیں یہ جاپانی — اُن کی جو چیز ہے وہ کھوٹی ہے
مل گیا جو اُسے غنیمت جان — یہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہے

'احسان' کے زمانے میں فکاہی ادبی رسالہ 'شیرازہ' (۱۹۳۶ء) منظرِ عام پر آیا۔ اس میں حسرت کی نظمیں غزلیں اور پیروڈیاں وغیرہ شائع ہوتی رہیں۔ ان سب اخبارات و رسائل کے ساتھ حسرت وابستہ رہے۔ ان کے علاوہ وہ رسائل جن میں حسرت کی تحریریں کبھی کبھار شائع ہوئیں، اُن میں اختر (لاہور) ادبی دنیا، ساقی اور نئی صدی (دہلی) وغیرہ شامل ہیں۔

چراغ حسن حسرت کی چھ سات غزلوں کے سوا کوئی اور شعری نگارشات مرتب صورت میں نہیں ملتیں۔ منتشر چیزوں کی جمع آوری کا کام اور مرحلہ خاصہ کٹھن تھا۔ خاص طور پر کلکتہ و سنگاپور کے قیام کے دوران جو کچھ انہوں نے کیا، اُن کا حصول صبر و شکیب کا متقاضی تھا۔ سنگاپور میں حسرت کے شب و روز کے ساتھیوں سے ملاقات کر کے دو تین چیزوں کو ڈھونڈ نکالنا بڑی طمانیت کا باعث بنا۔ پھر رسالہ 'آفتاب' کا نام تو ایک آدھ بار پڑھا تھا حتیٰ کہ حسرت کے بارے میں لکھے گئے مضامین میں مضمون نگاروں نے 'آفتاب' کا ذکر تک نہیں کیا لیکن اس گوہرِ نایاب تک بھی رسائی ہوگئی۔ حسرت کی سیاسی فکاہیہ نظمیں 'امروز' وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ بچوں کی نظمیں 'پھول' اور 'تہذیبِ نسواں' کے متفرق شماروں سے حاصل کی گئی ہیں۔

چراغ حسن حسرت کی شاعری کا زمانہ تقریباً ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۹ء - ۱۹۵۰ء کے عرصے پر محیط ہے۔ اکیس بائیس سال کی عمر تک انہوں نے جو کچھ لکھا اُس کی کچھ جھلکیاں 'احوال و آثار' میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کچھ موجود تھا تو وہ ضائع ہوگیا۔ اُن کی باقاعدہ شاعری کا آغاز 'آفتاب' کلکتہ سے ہوا۔

٭ ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ چراغ حسن حسرت پھول اور تہذیبِ نسواں سے منسلک ہوئے اور اُس کی ترتیب میں مدد دینے لگے۔

چراغ حسن حسرت نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ۔ غزل تو اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی ۔ غزل کے علاوہ سنجیدہ نظمیں، فکاہیہ نظمیں اور بچوں کے لئے نظمیں بھی اُن کے کلام میں شامل ہیں ۔ نظموں میں کچھ انگریزی نظموں سے ترجمہ کی گئی ہیں ۔ اور کچھ معروف شعراء کی نظموں کی پیروڈی کی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ رباعیات و قطعات بھی اُن کے کلام میں ملتے ہیں ۔

چراغ حسن حسرت کی شاعری (غزل) کے جائزے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو غزل کے ارتقاء پر نظر ڈال لیں تاکہ حسرت کی پیشِ نظر غزلیات کا اردو غزل کی تاریخ میں مقام و مرتبے کا تعیّن ہو سکے ۔

کئی سو سال سے غزل ہماری شاعری کی پہچان بنی ہوئی ہے ۔ اس کے وجود سے اُردو شاعری کا باغ شاداب اور آباد ہے ۔ ایک وقت تھا اردو شاعری اور غزل کو دو مترادف چیزیں سمجھا جاتا تھا ۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد اردو غزل میں جو ترقی و فراخی آگئی ہے وہ کسی اور صنف کو نصیب نہیں ہوئی ۔ غزل میں وسعت کے ساتھ ساتھ ہر دلعزیزی کا عنصر بھی زیادہ ہوتا چلا گیا ہے ۔ غزل نے ہر عہد میں وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے اور زمانے کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بڑے عمدہ طریقے سے اس کی ترجمانی کے فرائض ادا کیے ہیں ۔ " اردو غزل تین سو سال تک جاگیردارانہ تصوّرات کی عکاس بنی رہی اور آج

بڑی کامیابی کے ساتھ تمدّنی بحران اور تہذیبی خلفشار کو اپنی مخصوص رمزیت و ایمائیت کے دامن میں سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے[۲] "

غزل ہر دور میں پڑھنے والوں کے دلوں کو گرماتی اور برماتی رہی ہے ۔ مٹی کے گھروں میں بسنے والی مخلوق اور اس کے سَر کی شورشوں اور دلوں میں پلنے والے طوفانوں کا اظہار غزل سے بہتر کہاں ہو سکتا ہے ۔

عربوں کے جلو میں قصیدہ ایران تک آیا اور اِن فضاؤں میں قصیدے سے تشبیب کو جدا کر کے غزل کے قالب میں ڈھال دیا گیا ۔ ایرانی شاعروں نے دوسری اصنافِ سُخن

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ غالب سے اُردو غزل دو دھاروں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک رنگ غالب کا رنگ خاص تھا بقول رشید احمد صدیقی "اس میں غزل زندگی، زمانہ اور ذھن تینوں سے ساز و ستیز کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور بالآخر اقبال کے فیضان سے شاعری کی زندہ نمود بن جاتی ہے"۔ اور دوسرا دھارا وہ ہے جس میں غزل اپنی روایتی وضع قطع اور سج دھج سے آگے بڑھتی ہے۔ ہمارے ممدوح چراغ حسن حسرت اس دوسرے دھارے سے تعلق رکھتے ہیں۔

چراغ حسن حسرت ابتداء میں سے جن شعراء کے اسلوب سے متاثر ہوئے اُن میں حسرت موہانی کا نام سرِ فہرست ہے۔ حسرت خود بیان کرتے ہیں کہ وہ غزل گو شاعروں میں حسرت موہانی کا کلام پسند تھا[٦]۔ بعد میں شاد عظیم آبادی کی طرف بھی راغب ہوئے اور اُن کے حلقۂ تلمذ میں بھی آنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اِن دونوں شاعروں کے کلام خاص طور پر حسرت موہانی کی شاعری روایتی کلاسیکی تغزل کی حامل ہے۔ اُن کے ہاں تمام اساتذہ کے رنگ کم و بیش نظر آتے ہیں۔ یعنی طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض۔ حسرت موہانی کا اسلوب کسی خاص رویّے کا حامل نہیں یا وہ کوئی متفکر شاعر نہیں تھے لیکن اُن کے اسلوب میں حیرت انگیز جامعیت ہے۔ انہوں نے جیسا کہ خود کہا ہے غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن کی شاعری کے جاندار اجزاء لیکر ایک شاندار اسلوب پیدا کیا۔ حسرت موہانی کی غزل میں جدت طرازی اور خیال آفرینی کی عدم موجودگی کے باوجود بھی ایک تاثر اور تاثیر موجود ہے۔ حسرت موہانی کی غزل میں حُسن پرستی کا جذبہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی نوعیت انسانی ہے۔ یہ جذبہ حقیقی ہے تصوراتی نہیں۔ حسرت موہانی کی غزلوں میں رنگینی و رعنائی کا کرشمہ، اُن کی زبان پر مہارت اور گرفت کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی زبان اور طرزِ بیان نہایت شستہ و شگفتہ ہے۔

چراغ حسن حسرت کی شاعری میں حسرت موہانی کا پرتو نظر آتا ہے۔ چراغ حسن حسرت بھی غزل کے کلاسیکی آب و رنگ سے اپنی غزل کو نکھارتے ہیں۔ موصوف کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ شائستگی کی حدوں کو پھلانگ جانا چراغ حسن حسرت کے نزدیک بھی معیوب اور ناپسندیدہ ہے۔

حسرت موہانی کی طرح چراغ حسن حسرت نے بھی شعراء کے انتخاب شائع کیے اس طرح وہ اردو کی کلاسیکی غزل سے کماحقہ مانوس ہو گئے جس کے اثرات اُن کی غزلیات میں ہر کہیں موجود ہیں۔

چراغ حسن حسرت نے اگرچہ نظمیں بھی لکھیں لیکن غزل کی طرف اُن کا میلانِ طبع زیادہ تھا اور وہ عشق کی حد تک غزل اور اچھے شعر کے شیدائی تھے۔ چراغ حسن حسرت کے تغزل پر کلاسیکی شاعری کا رچاؤ اور ایک ماہرانہ شان پائی جاتی ہے۔ اُن کی غزلیات میں گرمی و رعنائی اور سادگی و شگفتگی کا اظہار اس لطافت سے ہوا ہے کہ پڑھنے والا اس کا اثر اپنے دل تک محسوس کرتا ہے۔

چراغ حسن حسرت کی زبان بڑی صاف اور ستھری ہوتی ہے۔ وہ زبان کی مٹھاس سے شعر میں خاص لطف پیدا کرتے ہیں۔ زبان و محاورہ کی صحت کا خیال اُن کا خاص امتیاز ہے۔

ہر غزل گو متقدمین یا معاصرین سے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت میں متاثر و مرعوب ہوتا ہے۔ یا اُن کا خوشہ چیں، یا اُن کے بارے میں اُس کی پسند یا ناپسندیدگی ضرور ہوتی ہے۔ چراغ حسن حسرت کے رنگِ سخن میں کئی شعراء کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ حسرت موہانی کے علاوہ شاد عظیم آبادی سے بھی حسرت کافی متاثر تھے۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> "اُن کے شعر کا ذخیرہ کم ہے لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے اُس سے کہنہ مشقی اور استادی کے تمام جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اُن کا رنگِ سخن زیادہ تر حضرت شاد عظیم آبادی سے متاثر ہے۔"

حسرت جس زمانے میں کلکتہ میں تھے "نو آفتاب" میں شاد کی غزلیات بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے اور ہمیشہ اُن کی استادی کے معترف رہے۔ اُس زمانے میں شاد کا چل چلاؤ تھا، حتیٰ کہ وہ ۱۹۲۷ء میں فوت ہو گئے، اور حسرت کی اُن کی شاگردی میں آنے کی خواہش دھری کی دھری رہ گئی۔

"آفتاب" مئی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں حسرت نے شاد عظیم آبادی کا ایک طویل منظوم خط فنِ شعر کے بارے میں شائع کیا۔ اس خط میں فنِ شعر کی جو اصولی اور ضروری باتیں کہی گئی ہیں، حقیقت میں حسرت بھی عملی طور پر اُن سے متفق نظر آتے ہیں۔ اس منظوم نادر خط کے شروع میں حسرت نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے جو خط کے پس منظر کے بارے میں ہے اُس کی چند سطریں درج کی جاتی ہیں:

"جس زمانہ میں مولانا حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری شائع ہوا تو ملک کے ہر گوشہ سے
اس کی مخالفت و موافقت میں صدائیں بلند ہونے لگیں۔ امیر مینائی مرحوم نے بعض
متنازعہ فیہ امور کی نسبت حضرت شاد سے استفسار کیا۔ انہوں نے نظم میں جواب دیا۔
فنِ شعر کے نکات و رموز کو نہایت وضاحت سے بیان کیا اور نہایت بالغ نظری سے
محاسن و معائبِ شاعری پر روشنی ڈالی۔ خط کیا ہے؟ بجائے خود فنِ شعر کی ایک
مبسوط کتاب ہے۔ جس میں اس فن کے تمام اصول اور ضروری باتیں آگئی ہیں۔ یہ نکتہ
قابلِ غور ہے کہ مرحوم خود انہیں امور پر عمل کرتے تھے اور اپنے کلام میں جابجا ان کا خاص
خیال رکھتے تھے۔"

اس طویل منظوم خط کو شائع کرنے اور اس پر نوٹ لکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ حسرت اس کے مندرجات
سے متفق بھی تھے اور ان سے مستفید و فیض یاب بھی ہوئے۔ اس خط میں مختلف عنوانات کے تحت فنِ شعر
کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے "شعر گوئی کس کو مناسب ہے" کے زیرِ عنوان ایک
دو اشعار لکھے جاتے ہیں:

خرد تروں سے بھی آگاہ ہو زمانہ کی	مذاقِ اہلِ جہاں سے بھی نہ ہو بے پروا
ہمیشہ اس کو تعصب سے اجتناب رہے	گداز ہو دلِ عاشق مزاج بھی اس کا
ہو اختلافِ مذاہب پہ بھی نظر اس کی	خصوص ہو فنِ تاریخ میں ید طولیٰ
تو ایسے شخص کو البتہ ہے شاعری کرنا	سرے رباعی وہ اس میں تو اسکو ہے زیبا

ان اشعار میں جن چیزوں پر زور دیا گیا ہے اور جن کا شاعر سے تقاضہ ہو رہا ہے وہ سب
چراغ حسن حسرت کی شخصیت میں موجود تھیں۔ شاد عظیم آبادی کے اثرات حسرت کی غزل پر
واضح ہیں۔ شاد نے دہلوی طرزِ تخییل کو لکھنوی زبان کے ساتھ بڑے خوب صورتی کے ساتھ ملایا ہے،
کہ غزلِ قدیم اور غزلِ جدید کے درمیان میں نہایت دل کش و موثر غزل نکل آئی ہے۔ شاد کے کلام
مضمون آفرینی زیادہ نہیں ہے۔ مترنم الفاظ نے ان کے اشعار کو پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ شاد کے کلام بیان کی
سادگی اور متانت، سادہ ترکیبیں، نرم لب و لہجہ، سوز و گداز کی جو کیفیت ہے وہ چراغ حسن حسرت کی غزلیا

میں بھی دیکھی جا سکتی ہے ۔

حسرت موہانی اور شاد عظیم آبادی کے اثرات کے ساتھ چراغ حسن حسرت کی شاعری
پر علامہ اقبالؒ کی شخصیت و شاعری کے واضح اثرات موجود ہیں ۔ حسرت اقبالؒ پر دو عدد کتابیں بھی لکھ چکے تھے ۔
اور اقبالؒ سے ایک دو ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں ۔ اس لئے اقبالؒ کی شاعری سے متاثر ہونا فطری بات تھی ۔
اقبالؒ کی عظمت کا شعور حسرت کو بہت پہلے طالب علمی کے زمانے میں ہو چکا تھا ۔ حسرت کی غزل کے
دو شعر درج کیے جاتے ہیں ۔ اقبالؒ کی غزل کے اشعار خود ہی ذہن میں ابھرنے لگیں گے ۔

ہجوم شوق اور راہ محبت کی بلا خیزی   کہیں پہلا قدم ہی آخری منزل نہ بن جائے
نہیں ہے دل تو کیا پہلو میں ہلکی سی خلش تو ہے   یہ ہلکی سی خلش ہی رفتہ رفتہ دل نہ بن جائے

اور اقبالؒ کی غزل کا مطلع ہے :

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے   جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اسی طرح حسرت کے کچھ اور اشعار پڑھ کر دھیان اقبالؒ کی طرف جاتا ہے ۔ حسرت کی ایک غزل
جس کا مطلع ہے :

دیر سے گرم جستجو تھی مری چشم آرزو ۔ دل کے صنم کدے میں آ او بت عشوہ ساز عشق

اس غزل کی مجموعی فضا ، تاثر اور موڈ اقبالؒ کی یاد دلاتا ہے ۔ اس کی تراکیب اور فارسی لہجہ اقبالؒ
کے بعد کے زمانہ کی غزلیات سے کافی مختلف ہیں ۔ جیسے بت عشوہ ساز ، دیدۂ امتیاز ، نوائے درد ،
مطرب حسن ، تار ساز عشق ، جبین سجدہ ریز ، وقف حریم ناز عشق وغیرہ ۔

۱۹۲۷ء میں لکھی گئی ایک غزل جس کا مطلع ہے :

انداز حسن یار بھی کیا تازہ کار ہے   ہے جاں ستاں کبھی ، تو کبھی جاں سپار ہے

میں بھی فارسی غزل کی لغت اس کے ساز و سامان اور تراکیب سے کام لیا گیا ہے ۔ فارسی الفاظ
دیکھیے ۔ تازہ کار ، جاں ستاں ، جاں سپار ، عصیاں ، آمرزگار ، عمر ابد ، جلوہ گہ برق حسن ، کارزار
ستم روزگار وغیرہ ۔

اس کے علاوہ ایک دو غزلیات اور بھی ملتی ہیں جس میں فارسی کی روایتی غزل کے اثرات اور فارسی

زبان وادب کا پرتو نظر آتا ہے ۱۹۲۷ء کے زمانے کی ایک غزل جس کا مطلع ہے:

؎ رندانِ مے پرست تو محفل سے اُٹھ گئے ۔ نغرا رہے ہیں میکدہ کے بام و در ہنوز

میں فارسی مرکبات ، اضافتِ ترکیب ، کا استعمال ہے بادِ غالیہ ، چشمِ التفات ، بخیۂ زخمِ جگر ، فریادِ نارسا ، کاہشِ فراق ، رسمِ ہناب وغیرہ ۔

چراغ حسن حسرت نے فارسی ادب کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا ۔ فارسی کی تدریس سے ابتدائی زندگی کا آغاز ہوا ۔ اس لئے فارسی شاعری کے رموز سے کماحقہ آگاہ تھے ۔ فارسی زبان میں گفتگو بڑی روانی سے کر لیتے تھے ۔ بقول سید عابد علی عابد "بتدریج یہ بات مجھ پر روشن ہوئی کہ وہ فارسی تو بہت اچھی طرح جانتے تھے ۔ عربی سے واقفیت حزدی ہے البتہ میں وہ بے تکلف عربی بولنے لگے تھے[9]" اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی شعر وادب پر اُن کی گرفت کتنی مضبوط تھی ۔ اردو نظموں میں بے تکلف فارسی اشعار اور مصرعے آتے تھے ۔ حسرت کی مشہور غزل ہے ؏ اندازِ حسنِ یار بھی کیا تازہ کار ہے ۔ اس پوری غزل میں فارسی کو بڑے اعتماد سے برتا ہے ۔ اُن کے ہاں فارسی کے الفاظ "علیحدہ" معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ اردو میں کھپ جانے والے الفاظ لائے ہیں ۔ اس غزل میں سارے قوافی فارسی کے ہیں جیسے آمرزگار ، حسنِ یار وغیرہ ۔

حسرت کی عربی تک رسائی بھی اظہار کو وسعت دیتی ہے ۔ جیسے

؏ وہ مستغنئِ ماسوا ہو گیا ۔ ؏ حسن کی مرضی معاذ اللہ

چراغ حسن حسرت کی غزل کے بارے میں شورش کاشمیری رقمطراز ہیں :

"حسرت غزل کے میدان میں منفرد مقام رکھتے تھے ۔ اُن کی شاعری میں ابہام اور پیچ وخم کی بات نہ تھی ۔ بلکہ اُن کی شاعری سیدھی سادھی وارداتِ قلب ونظر کی شاعری تھی ۔ اُن کا اسلوبِ فکر بھی دلآویز اور اندازِ بیان بھی بے حد شگفتہ تھا[10]"

حسرت کی غزل پر رائے دینے والے اکثر نقادانِ فن کا یہی خیال ہے کہ اُن کی غزل میں ابہام اور بات کو الٹ پھیر کر بیان کرنے کا رویہ نہیں ہے ۔ دل ونظر کی واردات کو سیدھے سادھے طریقے سے بیان کر دینا ہی اُن کا کمالِ فن تھا ۔ یہی چیز اُن کی غزل میں دلآویزی اور شگفتگی کا عنصر پیدا کرتی ہے ۔

ڈرتا ہوں کہ اُس چشمِ فسوں ساز کی گردش احساسِ تمنا کو تمنا نہ بنا دے

حسرت کو ہے تو آہیں تری بزمِ ناز میں کم بخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

مجھے پینے کا سلیقہ نہ سہی، یہ کہیے پاؤں پر ساقیٔ مےخانہ کے سر ہے کہ نہیں

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

اک عشق کا غم آفت، اور اس پہ یہ دل آفت یا غم نہ دیا ہوتا، یا دل نہ دیا ہوتا

آخری شعر پڑھ کر ذہن غالب کے اس شعر کی طرف جاتا ہے:

میری قسمت میں غم گر اتنے تھے دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

اس کے باوجود حسرت کا شعر اپنا ایک الگ تاثر اور ذائقہ رکھتا ہے۔

محولہ بالا اشعار میں وارداتِ عشق، آفاتِ غم، دردِ محبت کی خلش، محبوب کی چشمِ فسوں ساز کی گردش کا ذکر اتنی سادگی و پُرکاری سے کیا ہے کہ اشعار کی تاثیر اثر کیئے بنا نہیں رہتی۔

حسرت کے کلام میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کا ایک اپنا رنگ اور آہنگ بھی جھلکتا ہے جو انہی سے مخصوص ہے۔ اگرچہ ان کی غزلوں کی تعداد کم ہے پھر بھی اُن کا رنگِ سخن اپنے اندر کشش کا جوہر رکھتا ہے۔

حسرت کی غزلیات کی تعداد کم ہونے کی یہی وجہ ہے کہ فارسی اردو کا تمام کلاسیکی سرمایہ اُن کو ازبر تھا اس لئے وہ کسی نئی راہ یا اسلوب کے لئے راستہ مسدود پاتے تھے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"غزل کے معاملہ میں حسرت کا قول یہ تھا کہ استاد جو کچھ کہہ گئے ہیں اس پر اضافہ ناممکن ہے۔ منہ چڑانے کی اور بات ہے اور یہ کہتے وقت حسرت کوئی تکلف نہیں کرتے تھے۔ واقعی اُن کا ایمان تھا کہ شاد عظیم آبادی کے بعد اردو غزل ختم ہو گئی"۔

اس رائے کے باوجود حسرت نے کچھ ایسی غزلیں کہی ہیں جو اردو غزل کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ حسرت کے ہاں متقدمین شعراء کے رنگوں کی آمیزش تو نظر آتی ہے معاصرین کے انداز و افکار کی جھلک بھی ملتی ہے۔ پھر بھی حسرت کی غزل میں سادگی، نفاست، بندش کی

چشتی اور سب سے بڑھ کر زبان کی سلاست ایک الگ اپنی شان اور پہچان رکھتی ہے۔ عبدالمجید سالک نے لکھا ہے کہ:

"حسرت کا شاعرانہ کلام مقدار کے اعتبار سے کم لیکن لطافت کے لحاظ سے بعض معاصرین کے پورے مجموعوں پر بھاری ہے[۱۲]"۔

چراغ حسن حسرت کی محدود و منتشر غزلوں میں خوبی و رعنائی اور دلربائی کا جو عنصر موجود ہے وہ ہر کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔ کلام کا مختصر ہونا یا مائل بہ طوالت ہونا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اصل شے اس کی فنی اہمیت اور مقام ہے، اور وہ کس طرح ہمیں آسودہ بھی کر رکھے ہے۔ غزل کا موضوع تو انسانی جذبات ہیں، جو داخلی طور پر ایک فرد کے ہیں، لیکن ان میں ایک آفاقیت ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے دلوں کو جھنجھوڑتے ہیں اور غزل کا سب سے بڑا موضوع محبت ہے۔ دل کو چھونے کی کیفیت بہر طور حسرت کی غزلوں میں موجود ہے۔ شورش کاشمیری حسرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غزل ہو یا نظم، طنز کریں یا پیروڈی، نعت لکھیں یا منقبت قلم اُن کا موتی بکھیرتا ہے۔ اُن کا شاعرانہ کلام مختصر ہے لیکن جو لکھا ناپ تول کر لکھا اور دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ غزل اُن کی رسیلی ہوتی ہے۔ چند غزلیں ہیں کسی مجموعے کی شکل میں نہیں۔ اشعار کا ایک انتخاب ہے یا دوستوں کو بعض غزلیں اور اُن کے شگفتہ اشعار ازبر ہیں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں[۱۳]"۔

حسرت چوں کہ شاعری کی روایت پر کامل عبور رکھتے تھے اس لئے کلاسیکل غزل کے عمدہ و اعلیٰ عناصر کا حسین امتزاج اُن کی غزل میں نظر آتا ہے۔ حسرت اپنی غزل میں قواعد زبان اور اسالیب فن کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس لئے اُن کا معیار کہیں بھی گرنے نہیں پایا۔ اُن کے پیش نظر غزل کا ایک معیار و مقام تھا اور یہ معیار و مقام صدیوں کی کوشش و کاوش اور جگر کاوی کا نتیجہ تھا، جو کہ غزل کے میدان میں کی گئیں۔ حسرت کی تنقیدی نظر ادب و شعر میں کسی رو رعایت یا عام شے کو پسند کرنے کی خوگر نہیں تھی۔ "ایک افسوس ناک غلطی" کے زیر عنوان اپنے جریدے "شیرازہ" میں لکھتے ہیں "پچھلے دنوں راقم الحروف کی غیر حاضری میں "احساسِ حقیقت" کے نام سے ایک ایسی غزل "شیرازہ" میں چھپ گئی جو

ہرگز رسالہ کے معیار کے مطابق نہ تھی۔ "شیرازہ" کی غزلوں کا معیار ہمیشہ بلند رہا ہے۔ اس معاملہ میں راقم کی احتیاط کا یہ حال ہے کہ خود اپنی غزلوں سے اکثر اشعار کاٹ دیتا ہے"[۴]۔

حسرت کی نثر کا رنگ طنز و مزاح کا تھا، یہ رنگ کہیں کہیں غزل میں بھی اتر آیا ہے۔ حسرت کی غزل کے مطالعہ کے دوران ایک دلچسپ بات سامنے آئی ہے کہ موصوف اوّل درجے کے طنز و مزاح نگار صحافی تھے۔ طنز و مزاح کا پیکر لیے ہوئے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن مزاح کی پھوار غزل میں کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ اُن کی غزل میں معاصر سیاسی تحریکوں، ترقی پسندانہ نعرہ بازی اور معاشی مساوات وغیرہ کی صدائے بازگشت کہیں سنائی نہیں دیتی۔ حسرت روایت پسند شخصیت اور وضع دارانہ مزاج رکھتے تھے۔ اس لئے غزل کو کسی اوپری سوچ یا وقتی اور ہنگامی نعرے سے ملوث کرنا پسند نہیں کیا۔ البتہ ایک دو مقامات پر غزل میں خالص مزاحیہ یا سیاسی رنگ ملتا ہے۔ اور غزل کی مینا میں مزاح کا بلبلہ پھوٹتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن غزل میں اُن کا یہ رنگ سرگرم نہیں۔ حفیظ جالندھری کی غزل جس کا مطلع ہے:

~ دل ابھی تک جوان ہے پیارے — کس مصیبت میں جان ہے پیارے

پر چھ اشعار کی مزاحیہ غزل لکھی تھی۔

~ میرے چہرے کی جھریوں پہ نہ جا — دل ابھی تک جوان ہے پیارے
ناک تیری ہے ناک، آنکھ ہے آنکھ — اور ترا کان، کان ہے پیارے

غزل میں اس قسم کے اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس قسم کی چیزیں وقتی اور ہنگامی ہیں۔ جو شاعر کے من کی صحیح طور پر عکاسی نہیں کرتیں۔

~ جب سے آیا نہیں ہے تار اُن کا — پیرہن تار تار رہتا ہے

اس شعر میں لکھنوی دبستانِ شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ لفظی کھیل جس کی ایک نمایاں پہچان تھی۔ ایک دو اور غزلوں میں بھی یہ انداز موجود ہے،

~ جہازِ دل کا سوا مبتلائے موجِ بلا — ہے پاس ڈانڈ نہ پتوار دیکھیے کیا ہو
جنابِ شیخ کو سودا ہے دل فروشی کا — نہیں یہ بھوسے کا بیوپار دیکھیے کیا ہو

سیاسی لحاظ سے حسرت کا رجحان کانگرس کی طرف تھا۔ نہرو رپورٹ کی حمایت میں مضامین لکھے۔ حسرت

کبھی کبھار سیاسی جلسوں میں بھی جاتے رہے۔ ۱۹۳۹ء کی عالمگیر جنگ کے زمانے میں احرار نے سول نافرمانی کا اعلان کیا تو موصوف اس فیصلے سے خوش ہوتے دفتر احرار جا کر کہا کہ ؏ کچھ ہوئے تو ہی رندانِ قدح خوار ہوئے۔ تحریکِ کشمیر کی بھی حمایت کرتے رہے۔ اختر حسین رائے پوری نے لکھا ہے "وہ کلکتہ پر سیاست کا سرسام طاری تھا۔ ہر کس و ناکس جھنڈا اٹھائے جلسہ جلوس رچا رکھا ہے۔ جوش و خروش کا یہ حال تھا کہ میں نے چراغ حسن حسرت کو ایک دن سڑک پر للکارتے ہوئے سنا ؏ وہ سامنے ہے حریت کا راستہ بڑھے چلو، بڑھے چلو"[۵] ان سیاسی رجحانات کے باوجود اُن کی غزل سیاسی حوالوں سے پاک ہے۔ نظموں میں البتہ سیاسی اشارے موجود ہیں۔ غزل میں دو ایک شعر سیاسی پس منظر میں مل جاتے ہیں لیکن اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحافتی ضروریات کے تحت قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں:

خود ہیں امیدوارِ کونسل آپ — خود کو امیدوار کون کرے
آپ ہیں اور شکار ووٹوں کے — دل کا ب یاں شکار کون کرے

غزل گوئی کے ابتدائی ایام میں چراغ حسن حسرت نے کلاسیکل غزل گو شعراء کے انتخاب بھی شائع کیے۔ کچھ شعراء سے اثر پذیری کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے اور کچھ شعراء کی غزلوں پر غزلیں لکھ کر اُن کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور اُن کی طرف اپنے جھکاؤ کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ شاد عظیم آبادی اور حسرت موہانی کے اثرات کا ذکر گزشتہ سطور میں آ چکا ہے۔ چراغ حسن حسرت کی مشہور غزل کے دو شعر ہیں:

تبسم پیامِ قضا ہو گیا — یہ اک جنبشِ لب میں کیا ہو گیا
طرب خانۂ آرزو تھا کبھی — یہی دل جو ماتم سرا ہو گیا

'آفتاب' اپریل ۱۹۲۶ء کے شمارے میں حسرت اس غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ غزل مزاج حیدرآبادی کی غزل پر کہی گئی تھی جس کا مطلع ہے۔
تعلق ہجومِ بلا ہو گیا — طبیعت تجھے کہتے کیا ہو گیا"

چراغ حسن حسرت، کرنل مسعود کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نوجوانی کے زمانے میں جب میری مشقِ سخن کا آغاز تھا۔ مزاج کی اس غزل پر

میں نے بھی غزل کہی تھی ۔ مولانا حالی کے کلام بھی اس طرز کی غزل موجود ہے ۔ جس کا ایک شعر ہے :

؎ نہیں بھولتا تیری رخصت کا وقت ۔ وہ مل مل کے رونا بلا ہو گیا "

اس غزل کے علاوہ ایک اور غزل بھی حسرت نے حالی کی غزل پر لکھی ہے ۔ دونوں غزلیات کا ایک ایک شعر درج کیا جاتا ہے :

؎ جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح کچھ ہم سے سنا ہوتا ، پھر تو نے کہا ہوتا (حالی)

غیروں سے کہا تو نے ، غیروں سے سنا تم نے کچھ ہم سے کہا ہوتا ، کچھ ہم سے سنا ہوتا (چراغ حسن حسرت)

ساحل احمد لکھتے ہیں :

" حسرت نے غزل کی کلاسیکی روایت کو قائم رکھتے ہوئے جدت طرازی کی روش اپنائی "

حسرت کے اس مذکورہ بالا شعر میں جو حالی کے شعر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حسرت داغ کے کھل کھیلنے والے انداز کے پیرو نہیں تھے بلکہ حسرت موہانی کے محتاط انداز ، سچے اور گہرے جذبے اور دل نشیں زبان و بیان کو عزیز رکھتے تھے ۔

چراغ حسن حسرت نے اپنی غزلیات میں موسیقی کے رموز سے خوب فائدہ اٹھایا ہے ۔ ان کی اکثر غزلوں میں موسیقی کی ایک متوازن لہر ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہے ۔ سید عابد علی عابد نے حسرت کی موسیقی سے بھرپور آشنائی کا ذکر کیا ہے ۔ اپنی کتاب میں موصوف کی ایک غزل کا حوالہ دے کر اسے صوتی اعتبار سے ایک کارنامہ قرار دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " کم غزلیں اس شعوری کوشش سے کہی گئی ہیں کہ روش کا رنگ پیدا کریں[۱۷] " شیخ اسماعیل پانی پتی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے :

" حسرت اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اور موسیقی کے اسرار و رموز سے واقف تھے[۱۸] "

موسیقی کے آلشار کا بہاؤ ان کی اکثر و بیشتر غزلوں میں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ خاص طور پر یہ غزلیں جن کے مصرعے درج کیے جا رہے ہیں :

؏ دل بلا سے نثار ہو جائے ؏ انداز حسن یار بھی کیا تازہ کار ہے

؏ یارب شب ہجراں میں آنا تو کیا ہوتا ؏ آؤ حسن یار کی باتیں کریں وغیرہ

شاعر اپنی ذہنی کیفیت کے مطابق بحر اختیار کرتا ہے ۔ ردیف اور قافیہ کے ظاہری اور معنوی

دروبست کا لحاظ رکھتا ہے۔ ردیف اور قافیے کا موسیقیت میں عمل دخل اہلِ نظر جانتے ہیں۔ اِن چیزوں سے وہی شاعر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو شاعری کے تقاضوں اور لوازمات سے واقف ہو۔ حسرتؔ تو غزل کی ہر ادا سے واقف تھے۔ ثانی الذکر جن دو غزلوں کے مصرعوں کا حوالہ دیا گیا ہے، اُن غزلوں کی وجہِ شہرت میں اُن کے اندر پوشیدہ موسیقی کو بڑا دخل ہے۔ اِن کے قوافی اور بحور کے انتخاب نے ان کی ہر دلعزیزی میں اہم کردار ادا کیا ہے:

"قوافی اور بحور کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ یہ شعر کے ترنم کو قائم رکھتے ہیں۔ اور اظہارِ خیال کی بے راہ روی کو روکتے ہیں۔ شعر اور نظم میں سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ اس میں اصوات کی ہم آہنگی ہوتی ہے اور اِس میں اس کا فقدان۔"[۱۹]

اردو غزل کی مقبولیت میں سلیس، شیریں، اور شائستہ زبان نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ چراغ حسن حسرتؔ کی غزلوں میں یہ چیزیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اُن کی محدود غزلوں میں سے چند کا معروف ہو جانا اور اُن کے مصرعوں کا زبان زدِ عام ہو جانا بڑی تعجب انگیز بات ہے۔ اُن کی سادگی میں کرشمہ کاری ہے جو دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ:

"انہوں نے بہت کم تعداد میں غزلیں کہی ہیں اس کے باوجود اُن کے بعض مصرعوں کا ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر جانا اِس امر کا ثبوت ہے کہ وہ قادر الکلام تھے۔ ... اُن کی شاعری اور شیریں سلاست ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے اُن کے بیشتر معاصرین محروم تھے۔"[۰]

اس سلسلے میں چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

اُن سے تھا ایک رابطہ نہ رہا | کوئی جینے کا آسرا نہ رہا
جب سے تم آشنا ہوئے اپنے | کوئی دنیا میں آشنا نہ رہا

دل پہ مانا کہ اختیار نہیں | اور اگر اختیار ہو جائے
زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی | موت ہی غم گسار ہو جائے

---

۰ احمد ندیم قاسمی کا خط راقم کے نام۔ محررہ ۲۹ اپریل ۱۹۹۰ء

؎ ہیں ہوں اور میری بے پروبالی   دل ہے اور دل کی جرأت پرواز

اِن اشعار میں زبان کی شائستگی، سلاست، اور شیرینی حسرت کی استادانہ مہارت اور فنی عظمت کی خوب صورت مثالیں ہیں۔

غزل کی اپنی ایک شان ہوتی ہے۔ جو خیال غزل کے دو مصرعوں میں ادا کیا جا سکتا ہے وہ نظم کے کئی مصرعوں میں جا کر ادا ہوتا ہے۔ غزل کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے جو فکر و خیال کو دل کشی، شگفتگی اور جاذبیت بخشتا ہے۔ جس کی وجہ سے غزل کے اشعار زبان زدِ عام ہو کر ضرب المثل بن جاتے ہیں۔ اردو غزل کا کمال یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں اشعار اور مصرعے پڑھنے والوں کے حافظوں میں محفوظ ہیں۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؒ کے اشعار اور مصرعے سب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ عام گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ زبان زدِ عام مصرعوں میں ایک سچائی، ایک حقیقت، ایک روانی، اور لوگوں کی خواہشات اور تمناؤں کی تسکین کرنے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کے مقبولِ عام ہونے کے جو اسباب بیان کیے ہیں اُن میں ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ،

> وہ بہترین شعر ایک طور پر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے۔ سہل ممتنع بھی اس کا ایک پہلو ہے۔ کسی شاعر کے مقبول ہونے کا ایک معیار یہ ہے کہ اُس کے کتنے اشعار زبان زدِ عام ہو گئے؟[۲۰]

چراغ حسن حسرت کی غزلوں میں یہ کمال اور کرشمہ موجود ہے۔ غزلیات کی کم تعداد کے باوصف اُن کے مصرعے زبان زدِ عام ہو گئے ہیں۔ جن سے زبان، ذہن اور ذوق کو آسودگی اور شادابی حاصل ہوتی ہے۔ اکثر لوگ تو جانتے بھی نہیں کہ اِن مصرعوں کا خالق کون ہے۔

؎ رات کی بات کا مذکور ہی کیا   چھوڑیے رات گئی بات گئی

؎ آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں   زلف کی رخسار کی باتیں کریں

؎ محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے   محبت سے لیکن بڑا کام کیا ہے

؎ راہ میں اُس سے ملاقات ہوئی   جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

؎ غیروں سے کہا تونے، غیروں سے سنا تم نے   کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

چراغ حسن حسرت سے کہاں کچھ غزلیں چھوٹی بحر میں بھی ملتی ہیں۔ چھوٹی بحر کے لئے جب تک واردات کی شدت اور اظہار کی توانائی نہ ہو بات نہیں بنتی۔ حسرت نے چھوٹی بحر میں کہی گئی غزلوں میں سادہ جذباتِ محبت کا اظہار کیا ہے۔

؎ تم رہو، محبت رقیب رہے میرا کیا ہے رہا رہا نہ رہا
غیر کے تم تھے، غیر کے تم ہو دل ہمارا تھا مگر ہمارا نہ رہا

حسرت محبت کے بعض تجارب کو اس روانی اور خوبی کے ساتھ سے کر آئے ہیں کہ ان کو گفتگو کہا جاتا ہے۔

؎ جوانی مٹ گئی لیکن خلشِ دردِ محبت کی جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

یہ بے تکلفی ہی اُن کی غزل کی جان ہے۔ کہیں لفظوں کے درمیان فرق پیدا کر کے حسن پیدا کیا گیا ہے۔

؎ محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں کہیں محسوس ہوتی ہے، کہیں معلوم ہوتی ہے

حسرت کی وہ غزل جس کا مطلع ہے ع یارب شبِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا ۔۔۔ اس غزل کا انداز دل کو موہ لیتا ہے۔ اس غزل میں شاعر نے محبت کی واردات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ میں بھی اگر اُن کی جگہ ہوتا تو یہی محسوس کرتا۔ حسرت نے اظہار میں دور کا قرینہ نہیں رکھا بلکہ بے تکلفی کا انداز ہے۔ اس قسم کے زور دار اشعار بھی غزلوں میں ملتے ہیں۔

؎ مجھے پینے کا سلیقہ نہ سہی یہ کیسے پاؤں پر ساقیٔ مے خانہ کے سر ہے کہ نہیں

حسرت کی ایک اور غزل جس کا مطلع ہے۔

؎ جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز سوز ہے سوز، اور نہ ساز ہے ساز

اس غزل میں فراق کے تیور دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دو مصرعے بھی اس لائق ہیں کہ اُن کا حوالہ دیا جائے۔

ع سارا عالم ہے گوش بر آواز ع اے غمِ یار تیری عمر دراز

اس پوری غزل میں تجلیلِ غم ہے جو فراق کے ہاں ملتی ہے۔

غزل کا قدیم انداز تو یہ تھا کہ ایک شعر آسمان کا دوسرا زمین کا تیسرا آہ وزاری کا اور چوتھا کیف ومستی کا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ غزل کا مزاج بھی بدل گیا۔ آج کی غزل میں موڈ کا تسلسل

بآسانی دریافت کیا جاسکتا ہے۔ غزل کے سب اشعار خیالات اور جذبات و احساسات کے لحاظ سے متنوع ہوں پھر بھی اُن میں ایک قسم کی وحدت پائی جاتی ہے۔ حسرت کی غزلوں میں خیالات کی ایک رو ہے۔ اُن کی مشہور غزل ع یارب شب ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا۔ میں جذبے کی آنچ مسلسل ہے جو تمام اشعار میں سفر کرتی محسوس ہوتی ہے۔

حسرت کی غزل میں لفظی اختصار کا بڑا خیال رکھا گیا ہے۔ کہیں کوئی زائد یا بھرتی کا لفظ نظر نہیں آئے گا۔ اختصار غزل کی خوبی ہے اور یہ خوبی حسرت کا طغرائے امتیاز ہے۔ شورش کاشمیری نے اُن کی غزل کے بارے میں کہا ہے کہ وہ غزل اُن کی رسیلی ہوتی ہے"[۲۱] یہ رس زبان شگفتگی اور بیان کی گھلاوٹ سے پیدا ہوا ہے۔ حسرت کو زبان و محاورہ کی صحت کا خیال بے پناہ تھا۔ اُن کی زبان طبیعت میں شادابی اور تازگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ حسرت زبان اور جذبے کی ہم آہنگی کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ بقول سید ضمیر جعفری وہ عمدہ خیال ہو اور شعر بھونڈا، حسرت کو ہرگز پسند نہ تھا"*

ع آپ کا اعتبار کون کرے حشر تک انتظار کون کرے

ہم ہیں مجبور، آپ ہیں مختار جبر کو اختیار کون کرے

اِن اشعار میں زبان کی شگفتگی، بیان کی گھلاوٹ، اور بات کرنے کا سلیقہ بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

چراغ حسن حسرت کی یہ غزل جس کا مطلع ہے۔

ع آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں زلف کی رخسار کی باتیں کریں

نے نقادانِ شعر کو بھی متاثر کیا ہے، اور عام قاری کو بھی۔ غزل کے اندر ایک دھیما پن ہے جس کا احساس مطلع پڑھنے کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ سادگی ہے، روانی ہے، ایک تکلمی انداز ہے جو سرگوشی کی حدوں سے جا ملتا ہے۔ دوسروں کو اپنے معاملاتِ حسن و عشق میں شامل و شریک کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اردو شاعری کی روایت کے برعکس رقابت کی نفی کی گئی ہے۔ اس غزل کے مشہور ہو جانے کی ایک وجہ تو اس کی زبان کی سلاست و سادگی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر انسان کے دل کی بات کی گئی ہے، جو ذرا بھی عشق کی گرمی اور حرارت محسوس کرتا ہے۔ اس غزل کا رنگ اور رنگینی اور انداز

---

* سید ضمیر جعفری سے انٹرویو بسلسلہ "حسرت کی شخصیت اور شاعری"۔

بعد میں فیض احمد فیض کی غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حسرت اور فیض کے استاد اور شاگرد کے مراسم پیشِ نظر رہیں تو اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

پروفیسر جیلانی کامران کے خیال کے مطابق "اس غزل میں حسرت کا رویہ کلاسیکی نہیں ہے بلکہ اس میں زمانے کے بدلتے ہوئے رویوں کے ساتھ زندگی کو قبول کرنے کا رویہ ہے۔ وہ دکھوں کے باوجود زندگی کو قبول کرتے ہیں، احساسِ ہزیمت کی نفی ملتی ہے اور دل گرفتگی کی بجائے سرخوشی کا احساس ملتا ہے"*۔ جیلانی کامران صاحب کی یہ رائے تو قابلِ قبول ہے کہ اس غزل میں احساسِ ہزیمت کی نفی اور دل گرفتگی کی بجائے سرخوشی کا احساس ملتا ہے۔ لیکن یہ بات محلِ نظر ہے کہ اس غزل میں ان کا رویہ کلاسیکی نہیں ہے۔ حالانکہ پوری غزل میں ہماری کلاسیکی غزل کی پرچھائیں صاف دکھائی دے رہی ہے۔ سید عابد علی عابد، حسرت کی غزل پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غزلیں انہوں نے گنتی کی لکھی ہیں۔ جو پانچ دس غزلیں ان کی مشہور ہیں وہ ایک کارنامہ ہیں ان کے پسِ منظر میں سارے کلاسیکی اردو ادب کی روایت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حسرت کی غزل ایسی ہوتی ہے، جب تک سننے والا اپنی شعری روایت سے کما حقہ آگاہ نہ ہو ان کے اشعار کا پورا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا"[۲۲]۔

عابد علی عابد نے اسی مضمون میں آگے چل کر مذکورہ بالا غزل کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اس غزل کے مضامین کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حسرت کلاسیکی پسِ منظر اپنا کر جدید اسلوب میں کچھ باتیں کہی ہیں۔ مثلاً مطلع کا پہلا مصرع بالکل جدید اسلوب کا حامل ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد زلفِ عنبر بار، طرۂ طرار کی تراکیب ذہن کو کھینچ کر کلاسیکی روایت کی طرف لے جاتی ہیں ... حسرت کی غزلیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ذہنی رجحانات اور فکری معتقدات جو کسی گوشے میں دبکے بیٹھے تھے وہ شعور کی دنیائے مستنیر میں آکر روشن ہو گئے ہیں"[۲۳]۔

اس تجزیے کی روشنی میں حسرت کی غزل کے بارے میں یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی غزل میں

---

* ۲۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو پروفیسر جیلانی کامران سے حسرت کی غزل کے بارے راقم کی گفتگو۔

جس طرح جذبے کی تہذیب کرتے تھے اور اپنے اشعار میں ایک خاص قسم کی وضع داری ملحوظ رکھتے تھے، جس سے قاری کو ایک رکھ رکھاؤ کا احساس دیتے ہیں وہ اُن کے معاصر غزل گو شعراء کے ہاں خال خال نظر آتا ہے۔

چراغ حسن حسرت کی غزل کے بڑے موضوعات غم جاناں اور غم دوراں ہیں باقی موضوعات بھی اِن سے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک اور موضوع جو اُن کے ہاں کئی مواقع پر نظم ہوا ہے وہ "موت" کا موضوع ہے۔ انہوں نے موت کو مختلف جہتوں سے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہاں حسرت کے پسندیدہ شاعر* وحشت کلکتوی کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے جو حسرت کے حالات پر صادق آتا ہے۔

دلِ افسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا — کہ دہر میں کوئی شے وجہِ دل کشی نہ رہی

حسرت کی افسردگی اور موت کا ذکر اپنے پس منظر میں کچھ وجوہات رکھتا ہے۔ ایک تو اردو شاعری کی عام روایت ہے کہ عاشق محبوب سے دوری و مجبوری کے سبب ناکام و افسردہ ہوتا ہے یہ اس کے لئے سوہانِ روح بن جاتی ہے تو وہ موت کی تمنا کرنے لگتا ہے، یا مختلف طریقوں سے موت کا ذکر کرتا ہے۔ پھر غم جاناں کے ساتھ غم دوراں بھی زندگی سے گریز پائی اور کنارہ کشی پر شاعر کو مجبور کرتا ہے۔

"وہ فکری لحاظ سے حسرت انسانی عظمت اور معاشی عدل کے حامی تھے۔ وہ اپنے اندر زیادہ جیتے رہے۔ معاشی ناآسودگی کا انہیں احساس تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ لکھنے لکھانے سے معاشی آسودگی نہیں آتی ... دوسروں پر اعتماد کر لیتے تھے اور اس طرح دھوکہ کھا جاتے.. وہ بڑے فراخ دست تھے... تانگے پر بیٹھتے تو یہ بتانا بھول جاتے کہ کہاں جانا ہے۔ یہی اُن کا فلسفہ حیات بن گیا۔ چلتے جاؤ معلوم سے نامعلوم کی طرف°"

جو شخص معاشی ناآسودگی کا شکار ہو، فراخ دست ہو، دوسروں پر اعتماد کر کے دھوکا کھاتا ہو وہ یقیناً پریشانی اور ذہنی خلش و خلجان کا شکار ہوگا۔ حسرت کی زندگی میں چھوٹے چھوٹے عشق تو رہے ہوں گے، لیکن سنگاپور میں ایک بڑے عشق نے اُن کو نڈھال کر رکھ دیا×۔ اُسی کا درد اور کسک دل میں دبائے وہ وطن لوٹے اور پھر آخری دم تک انہیں یادوں کے سہارے زندگی بسر کرتے رہے۔

---

* قیام کلکتہ میں حسرت اپنے رسالے 'آفتاب' میں وحشت کا کلام تعریفی کلمات کے ساتھ شائع کرتے رہے۔

° سید ضمیر جعفری سے انٹرویو۔

× اس سلسلے میں حسرت کا اکلوتا انگریزی خط مقالے کے آخر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

غمِ جاناں اور غمِ دوراں ہر دو نے مل کر موت کو اُن کا پسندیدہ موضوع بنا دیا ہے۔ کئی احباب نے اُن کی معاشی الجھنوں اور کئی دوسرے غموں کا تذکرہ کیا ہے۔ سیّد ضمیر جعفری حسرت کی اُداسی کے عوامل کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"اُن کی اُداسی تو کائناتی تھی اور ایک اُداسی اُن کی ذاتی (زندگی کے حوالے سے) اُن پر حاوی رہی۔ وہ یہ کہ حسبِ خواہش زندگی پونچھ میں نہ گزار سکے اور اُن کو سلطان ماحول نہ مل سکا جہاں فراغت کتابیں، اور گوشۂ چمن کی زندگی گزار سکتے۔"°

حسرت خود دار اور وضع دار شخصیت کے حامل تھے اس لئے وہ اپنی روش پر چلتے رہے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور زمانے کے دکھ جھیلتے رہے۔ حسرت دنیا دار ہرگز نہیں تھے۔ وہ اندر سے ایک بچّے کا سا بھولپن رکھتے تھے جو زمانے کے نشیب و فراز سے قطعی نا آشنا ہو۔ صوفی تبسم لکھتے ہیں کہ:

"حسرت عجیب مردِ قلندر تھے۔ ادب و شعر کی کائنات نظر میں سمائی تھی لیکن اپنے گرد و پیش کی لستی دنیا سے بڑے غافل تھے۔ ایسے قلندر مزاج انسانوں کی زندگی تلاشِ کفن کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ حسرت جیسے خالی ہاتھ دنیا میں آئے تھے ویسے ہی خالی ہاتھ چلے گئے۔"

ان اشارات سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ وہ موت کو شعوری اور لاشعوری طور پر اپنا موضوع کیوں بناتے ہیں۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

؎ اک وہ کہ جن کو عمرِ ابد کی ہے آرزو — اک ہم وبالِ زندگی مستعار ہے

غمِ جاناں کے ساتھ غمِ روزگار کا ذکر بھی اس غزل میں کیا ہے۔

؎ حسرت یہ بے خودی ہے کہ اتنی خبر نہیں — اُن کی نظر ہے یا ستمِ روزگار ہے

؎ زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی — موت ہی غم گسار ہو جائے

حسرت زندگی کے غموں کا علاج موت میں تلاش کرتے ہیں۔ ایک پوری غزل جس کا مطلع ہے۔

؎ دل بلا سے نثار ہو جائے — آپ کو اعتبار ہو جائے

میں اُداسی کی ایک کیفیت طاری ہے جس میں محبوب اور زمانے کے غم اس طرح یک جان ہو کر

° سیّد ضمیر جعفری سے انٹرویو۔

سامنے آتے ہیں کہ اُن کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے تمام رشتے جب ختم ہونے لگتے ہیں تب بھی وہ محبوب کے غم کو یاد کرتے ہیں گویا محبوب کا غم غیر مختتم ہے:

؎ قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست اے غمِ یار تیری عمر دراز

اس شعر میں وہ انداز موجود ہے جو بعد میں فیض احمد فیض کے ہاں نظر آتا ہے۔

حسرت زندگی کو خوابِ پریشاں خیال کرتے ہیں۔ یہاں وہ فانی کی ہمنوائی کرتے نظر آتے ہیں۔

؎ زلف برہم ہے، دل آشفتہ، صبا آوارہ خواب ہستی سا نہیں خوابِ پریشاں کوئی

حسرت کے ہاں یہ رویہ، سوچ اور انداز اولین ایام سے دیکھا جا سکتا ہے ۱۹۲۷ء میں ایک شعر ملتا ہے۔

؎ دل ہے اور شغل ماتمِ ہستی دیدہ ہے اور خوں فشانی ہے

پھر بعد کے زمانے میں یہ سوچ مسلسل نظر آنے لگتی ہے۔

؎ تری آرزو دل سے کیا جائے گی اسی کھیل میں موت آ جائے گی

؎ دمِ آخر وہ آگئے حسرت موت سے اب کوئی بہانہ کریں

؎ آپ اور سوگ میرے مرنے کا یہ کسی اور کو سنائیے گا

؎ راستہ اپنی موت کا حسرت ایسے دیکھ رہا ہوں

جیسے شامِ فراق کے مارے اُٹھ کے سحر کو دیکھتے ہیں

حسرت کے ہاں ایک پوری غزل ایسی ملتی ہے جس میں زندگی، موت، شبِ غم، چارہ گری کی تمنا، اور کرم سے بہرہ یاب ہونے کے مضامین ملتے ہیں۔ اس غزل کا مطلع ہے،

؎ شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی زندگی مختصر نہیں ہوتی

چراغِ حسن حسرت کی غزلیات کی مجموعی فضا یاس انگیز ہے۔ ایسی یاسیت جو ترفع سے ہمکنار کرتی ہے نہ کہ بے دلی یا بے زاری سے معاملت پر آمادہ کرتی ہے۔ سید ضمیر جعفری نے سچ کہا ہے۔

"حسرت کی غزلوں کی مجموعی فضا اُداس ہے۔ ایک گاڑھی سونی اُداسی

جیسے پونچھ کی وادی میں شام پھیل رہی ہو*"

---

٥ پونچھ حسرت کا آبائی وطن جہاں وہ سکونت اختیار کرنے کی ہمیشہ خواہش رکھتے تھے۔

* سید ضمیر جعفری سے انٹرویو۔

حسرت کے کہاں یاس انگیزی، اداسی اور افسردگی کی جو فضا ملتی ہے اُس کے اظہار میں انہوں نے بڑی فن کاری اور مہارت سے کام لیا ہے۔

چراغ حسن حسرت راسخ العقیدہ مسلمان تھے انہوں نے کبھی کسی کو اسلامی شعائر کے بارے غیر محتاط رویہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی۔ کوتاہیاں کس میں نہیں ہوتیں۔ حسرت میں بھی کچھ کمزوریاں تھیں، لیکن موت کا تصور ان کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا (اور یہ مومن کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے) وہ تسلسل سے کسی نہ کسی طرح موت کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ کیا خوب کیا ہے:

رندِ مے خوار بھی جنت کا طلب گار بھی ہے
آج حسرت سا نہیں مردِ مسلمان کوئی[٥]

چراغ حسن حسرت کی غزل کے جائزے میں اُن کے معاصر غزل گو شعراء کا ذکر بھی آئے گا۔ اختر شیرانی حسرت کے معاصرین میں سے تھے۔ اختر کی شاعری حسنِ مجازی کے لطیف جذبات سے معمور ہے۔ اُن کے کلام میں سرمستی کی کیفیت ملتی ہے۔ اختر کی غزل کا ایک شعر ہے:

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

اسی زمین میں سیماب اکبرآبادی پہلے ایک غزل لکھ چکے تھے جس کا ایک شعر ہے:

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہیں محسوس ہوتی ہے

حسرت کی ایک غزل جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی محولہ بالا دونوں غزلوں سے پہلے لکھی گئی ہے۔ لیکن حسرت کی غزل میں جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ اپنا ایک جُدا رنگ اور اسلوب رکھتے ہیں۔ حسرت کی غزل پانچ اشعار پر مشتمل ہے اور پانچوں شعر ہی انتخاب ہیں۔ دو شعر درج کیئے جاتے ہیں:

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

---

٥ زمیندار، ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء

ے امیدِ وصل نے دیوکے دے بیٹھے ہیں اسقدر حسرت

کہ اُس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

اس غزل میں ایک مصرع ہے "مہر آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے" کے بارے میں حسرت ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس مصرعے کو لکھنے میں نظیری کا یہ مصرع پس منظر میں روشن تھا "گریبانم گریبانست و داماں داماں است امشب"۔ حسرت کو یہ شعر فارسی شعر نے سجھایا، پھر سیماب نے اس غزل سے متاثر ہو کر غزل کہی، اور اس کے بعد آخر نے ایک دو اچھے شعر نکالے اور اسی طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا گیا۔

حسرت کے ہم عصر شعراء میں ساغر نظامی بھی بڑے معروف شاعر تھے۔ اُن کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ساغر کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں تاکہ حسرت کے اشعار کے ساتھ رکھ کر موازنہ کیا جا سکے کہ کن اشعار میں استادی و فن کاری کے جوہر نمایاں ہیں۔

ے کیوں روک دیا تم نے آنکھوں کے اشاروں سے دلچسپ تھا افسانہ کہنے تو دیا ہوتا

مارا مجھے اے ساغر فطرت کی عنایت نے یا وہ نہ ملے ہوتے یا دل نہ ملا ہوتا

اختر شیرانی کی طرح ساغر بھی حسرت کے ہم عمر تھے کہنہ مشقی کے باوجود اُن کے شعر حسرت کے درج ذیل اشعار کے مقابلے زیادہ جاذب توجہ نہیں ہیں۔ حسرت کی یہ غزل اردو کی مشہور ترین غزلوں میں ہے۔

ے یارب شبِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت، اور اس پہ یہ دل آفت یا دل نہ دیا ہوتا، یا غم نہ دیا ہوتا

سید ضمیر جعفری نے ایک گفتگو میں فرمایا تھا کہ:

"حسرت نے جس بحر میں جتنی غزلیں کہی ہیں وہ اُن کے معاصرین میں سب سے بہتر تو ہوں گی کم تر نہیں"

مذکورہ بالا اشعار کے موازنے سے اس بات کی تصدیق بخوبی ہو جاتی ہے۔

چراغ حسن حسرت کی غزل کی دل کشی اور خوبی اُس کا تغزل ہے۔ حسرت کے ذہن میں غزل کے بنیادی مطالبات موجود تھے۔ وہ غزل کی روایت کو سمجھتے تھے۔ حسرت کی غزلیات کے

---

۱۲۹ اپریل ۱۹۹۰ء کو راقم نے سید ضمیر جعفری صاحب سے ایک انٹرویو کیا تھا اس میں موصوف نے حسرت کی غزل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

تجزیے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اُن کے یہاں جذبے کی صداقت ، غنائی کیفیت ، لفظ و معنی کا خوب صورت پیوند ، اور خاص قسم کی نغمگی و موسیقیت کے عناصر ایک اعتدال اور توازن کے ساتھ آئے ہیں۔

اُردو کی کلاسیکی غزل کے ساتھ لگاؤ نے حسرت کی غزل میں ایک شانِ دلربائی پیدا کر دی ہے۔

حسرت کی ہمہ گیر شخصیت نے اُس دور کے شاعروں اور ادیبوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ سید عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ :

"وہ شاعر گر بھی تھے اور موجودہ نسل کا شاید ہی کوئی بدنصیب ایسا ہوگا جس نے اُن سے کسی نہ کسی مرحلے پر فائدہ نہ اٹھایا ہو"[۲۵]

چراغ حسن حسرت نے کلاسیکی روایت کو قائم رکھتے ہوئے جدت طرازی کی پُرکشش روش اپنائی۔ اور اردو غزل کے سرمائے میں ایک خوش گوار اور باقی رہنے والا اضافہ کیا۔

چراغ حسن حسرت نے غزلیات کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر سینتیس[۳۷] کے قریب نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اُن میں کچھ طویل نظمیں بھی ہیں جو اُن کی فن پر قدرت اور موضوع پر گرفت کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کی ابتدائی دَور کی نظموں کا زمانہ وہی ہے جس زمانے میں وہ غزلیں بھی لکھ رہے تھے۔ اور یہ زمانہ کلکتہ کے قیام کا زمانہ ہے۔ ابتدائی زمانے کی غزلوں اور نظموں میں (۱۹۲۶ء) ایک قدرِ مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہر دو میں فلسفیانہ تفکر کے رنگ نمایاں ہیں۔ اگر اُن کی غزل میں اس قسم کے اشعار ہیں:

؎ نگاہِ فتنہ ساز کے یہ سارے امتیاز ہیں　　جو غور کیجئے تو کچھ بلند ہے نہ پست ہے

دماغ و دل میں ارتباط ہو تو کس طرح سے ہو　　یہ بندۂ خرد ہے اور وہ جنوں پرست ہے

تو نظم میں بھی سوچ اور فکر کے ایسے پہلو موجود ہیں جب سوچنے والا کائنات کے مسائل اور خالقِ کائنات کے بارے غور کرنے پر آمادہ ہوتا ہے:

؎ بلبل کی نوائے درد میں تو　　ناکام کی آہِ سرد میں تو

ہنگامۂ ہست و بود تجھ سے　　ہے کار گہِ وجود تجھ سے

یہ رنگِ سخن وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا گیا۔ غزلیات اور نظموں میں شاعر کی توجہ بلندیوں سے اتر کر زمین کے ہنگاموں تک آجاتی ہے۔

حسرت کی نظموں میں کچھ منظوم ترجمے ہیں مثلاً 'آخری پھول'۔ 'محبت اور امید'۔ یہ دونوں نظمیں ٹامس مور (انگریزی ادب) کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہیں۔ تیسری نظم 'نغمہ اور امید' کسی نامعلوم مصنف سے مستعار لی گئی ہے۔

کچھ نظمیں متفکرانہ ہیں جس میں دل اور دنیا کا قصہ موجود ہے۔ جیسے 'افسانۂ دل'، 'فلسفۂ حیات'، اور نیا زمانہ وغیرہ۔

تاثراتی نظموں کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے جیسے 'حسن'، 'تصویر کو دیکھ کر'، اِن نظموں میں ہیئت کے تجربے بھی موجود ہیں۔

حسرت کی اِن نظموں میں کچھ نظمیں سیاسی موضوعات کی حامل ہیں۔ 'جنگ نامۂ وزارت'،

ایک طویل نظم ہے۔ 'یونی نسٹ پارٹی کی شان میں چند بٹے'، 'چاجورگرم' اور 'حرف و حکایت' وغیرہ۔

حسرت چوں کہ خود ایک منجھے ہوئے صحافی تھے اور صحافت میں قدم رکھ کر کوئی سیاسی نظریہ نہ رکھنا عجیب سی بات ہے، اس لئے کچھ سیاسی نظمیں لکھیں جن میں طنزیہ و مزاحیہ رنگ موجود ہے۔

جدید شاعری کے سلسلے میں حسرت کی تین نظمیں ہیں۔ 'ایک نظم'۔ 'جدید شاعری' 'سرڈک'۔ ان نظموں میں ایک ردِّ عمل ہے جو مزاح کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

اختر شیرانی اپنے زمانے کے معروف ترین شاعر تھے اُن کی نظموں پر بھی مختلف احباب نے نظمیں لکھیں۔ حسرت کی اِن نظموں میں دو نظمیں اختر کی نظموں پر لکھی گئی ہیں۔ ایک نظم اُن کی تتبیع میں ہے اور دوسری تحریف نگاری کی ذیل میں آتی ہے۔

ایک دو نظمیں نجی قسم کی ہیں جیسے کرنل مسعود کی 'شادی کا سہرا' یا 'منظوم رسید' وغیرہ۔ یہ دونوں نظمیں حسرت کا مخصوص رنگ اور مزاج لئے ہوئے ہیں جو اُن کی بیشتر نثری تحریروں میں نظر آتا ہے۔ ایک نظم ہنگامی موضوع پر ہے جو 'پانی' کے عنوان سے موجود ہے۔ یہ نظم بھی حسرت کے مزاحی مزاج کی آئینہ دار ہے۔

حسرت کا ایک گیت بھی اِن نظموں میں شامل ہے۔ یہ اردو کا اولین گیت (ماہیا) ہے۔

حسرت کی اِن نظموں میں پانچ عدد رباعیات بھی ملتی ہیں جن کے موضوعات روایتی ہیں۔

حسرت و تاثیر کے معرکے میں کئی نظمیں لکھی گئیں۔ چوں کہ اِن نظموں کے لکھنے میں دونوں طرف سے کچھ شاعر طبع آزمائی کر رہے تھے اور یہ نظمیں فرضی ناموں سے چھپ رہی تھیں۔ حسرت نے اس معرکے میں کئی نظمیں سپردِ قلم کیں تاہم یہاں اِن نظموں میں سے معرکے کی صرف ایک نظم شامل کی گئی ہے جس کے بارے میں یقین تھا کہ یہ حسرت ہی کے قلم سے نکلی ہے۔ اس نظم میں جو کہ 'چھیڑا اچھی نہیں لوہا روں سے' کے عنوان سے ہے میں حسرت کی طبیعت میں روانی کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس سلیقے سے اپنی بات کہنے پر قادر تھے۔

حسرت کی نظمیں بہ لحاظ ہیئت مثنوی، قطعہ، رباعی، مربع، مسدس، اور ترجیع بند پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر مثنوی کی ہیئت کو استعمال کیا ہے اس لئے کہ خارجی حقائق کے

بیان میں مثنوی کی ہیئت زیادہ معتبر بھی ہے اور اظہار میں معاون بھی۔ خاص طور پر سیاسی نظمیں اسی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔

حسرت نے جو دو ایک تاثراتی نظمیں لکھی ہیں اُن کی ہیئت بھی اسی تاثر کے مطابق اختیار کی ہے۔ نظم 'حسن' میں سات سات مصرعوں کے بند ہیں آخری مصرع ٹیپ کا ہے۔ 'تصویر دیکھ کر' والی نظم میں پہلا بند پانچ اشعار یا دس مصرعوں پر مشتمل ہے بقیہ بند چھ چھ اشعار یا بارہ بارہ مصرعوں کے ہیں۔ دونوں نظموں میں ایک روانی اور بے ساختہ پن ہے۔

ان نظموں میں تضمینات بھی ملتی ہیں۔ جو مصرعے یا اشعار حسرت نے استعمال کیے ہیں وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے ہیں۔ یہ شاعر کا کمالِ فن یا طبعیت کا بہاؤ ہوتا ہے کہ مناسب مقام پر کسی اور شاعر کا شعر یا مصرع درج کر دیتا ہے جس سے اُس کی بات میں زور بھی پیدا ہوتا ہے اور تاثیر بھی۔ حسرت کے ہاں کئی تضمینات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ 'پیرِ طریقت کے نام' ایک نظم میں شیخ سعدیؒ کا یہ شعر لائے ہیں۔

محتسب در قفائے رنداں است　　غافل از صوفیانِ شاہد باز

سیاسی پس منظر میں لکھی گئی ایک نظم 'حرف و حکایت' میں سیاسی لیڈروں کی کھا پائی اور اُن کے سیاسی پینتروں کا ذکر کرتے ہوئے میر کا مصرع لائے ہیں جس نے سیاسی کھلاڑیوں کی بوالعجبیوں کا دلچسپ اور اثر انگیز نقشہ پیش کیا ہے:

لپاڈگی ہے کھا پائی ہے　　"شوق نے بات کیا بڑھائی ہے"

(لیڈری ہے کہ مرغ بازی ہے　　رہزنی ہے کہ راہ نمائی ہے)

سیاسی مناقشات پر دوسری نظم 'جنگ نامہ وزارت' ہے جس میں حافظ، سعدی، نظامی کے اشعار اور مصرعوں پر تضمین کی گئی ہے۔ نظم کا انداز ساقی نامے کا ہے اور ہیئت مثنوی کی ہے۔ نظم کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بدہ ساقی آں مے کہ تا دم زنیم　　قلم بر سرِ ہر دو عالم زنیم　　(حافظ)

الٰہی مجھے بھی سکندر بنا　　"کریما بہ بخشائے بر حالِ ما"　　(سعدیؒ)

؎ (وہ گالی کے چھرے وہ طعنوں کے تیر   گئے آن کی آن میں دل کو چیر)

اس شعر کے فوراً بعد نظامی گنجوی کے اسکندر نامے کا شعر لاتے ہیں جو بات میں زور اور اثر پیدا کر رہا ہے اور شاعر حسبِ خواہش فضا بنانے میں کامیاب ہوتا ہے:

؎ کمند اژدہائے مسلسل شکنج   دہن باز کردہ بہ تاراجِ گنج

چراغ حسن حسرت کی اولین نظم "تو" کے زیرِ عنوان آفتاب کلکتہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی حمدیہ نظم ہے جس میں خالقِ حقیقی کو مخاطب کر کے اُسے اپنی آرزوں اور جستجوؤں کا مرکز و محور قرار دیا ہے۔ اور ہنگامہ ہائے ہست و بود اور کارگہِ وجود کا اُس کو مرکزی نقطہ قرار دیا ہے۔ اس نظم میں فارسی تراکیب سے شیرینی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ نوائے درد، آہِ سرد، کارگہِ وجود، فغانِ بے اثر، جیسی تراکیب سے اظہار میں ایک تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ یہ اُس زمانے کی نظم ہے جب حسرت شملہ میں تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد کلکتہ کا رُخ کرتے ہیں۔ نظم میں اقبالؒ کے اثرات کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

نظم "افسانۂ دل" میں دل کی کہانی کمبڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اقبالؒ کے واضح اثرات موجود ہیں۔ اقبالؒ کی وہ نظمیں جو بانگِ درا کی زینت ہیں جیسے "حسن" وغیرہ کا پرتو اس نظم میں دیکھا جاسکتا ہے۔

"حسن" کے زیرِ عنوان حسرت کی ایک طویل نظم جو کہ بارہ بندوں پر مشتمل ہے، میں حُسن کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کبھی فطرت کی گود میں، کبھی انسان کی ذات میں، کبھی زندگی میں کبھی موت میں اُس کو تلاش کیا ہے اور دعوتِ نظارہ دی ہے کہ حُسن چاروں طرف بکھرا ہوا ہے مگر تو دیکھتا نہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے حسرت کی ابتدائی نظموں میں فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات بیان کیے گئے ہیں۔ ایک نظم فلسفۂ حیات کے نام سے ۱۹۲۶ء میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم میں بڑی فن کاری سے بلندیوں اور پستیوں کا ذکر ایک فلسفی کی نظر سے کیا ہے۔

؎ ہزار روکتا ہوں میں نگاہ کو اپنی   فرازِ عرش سے پھر بھی گزر ہی جاتی ہے
بلندیوں پہ جب پہونچتی ہے نظر میری   صدا یہ روح کی گہرائیوں سے آتی ہے
نظر فلک پہ ہے غافل ہے اپنی ہستی سے   بلندیاں بھی تو قائم فقط ہیں پستی سے

نظم کے آخری مصرعے میں بڑے سادہ اور دل کش انداز میں زندگی کی ایک ایسی حقیقت کو بیان کیا ہے، جو قاری کو فوراً اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے ہاں طویل نظموں میں یہ صورت نظر آتی ہے کہ ابتدا میں فطری مناظر کا ذکر کر کے قاری پر ایک مخصوص قسم کا ماحول طاری کر دیا جاتا ہے اور پھر شاعر حرفِ مطلب زبان پر لاتا ہے۔ اقبالؒ کی خضرِ راہ، اور طلوعِ اسلام وغیرہ میں یہی انداز ہے۔ حسرت نے بھی اپنی طویل نظموں میں فطری مناظر کا ذکر کر کے انسانی حسن کو اس میں اس طرح مدغم کر دیا ہے کہ ان دونوں کے فرق کو مٹا دیا ہے۔

'برکھا رت کی ایک رات' میں تشبیہات و استعارات ادھر ادھر بکھری ہوئی کائنات سے لائے ہیں۔ تارا، شرارا، سورج، آنسو، موتی، شمع، چرخ وغیرہ کو ایک حسینہ کے حسن کے ساتھ اس طرح پیوند دیا ہے کہ نظم کا ماحول جگمگانے لگا ہے۔

دوسری تمام نظموں کے برخلاف اس نظم میں حسرت نے کچھ ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً پیتم سے لو لگائے، ارماں مچل رہے ہیں، پی کی لگن لگی ہے، اگنی سلگ رہی ہے وغیرہ۔ حسرت کو ہندی زبان پر بھی دسترس تھی۔ ہندو دیومالا کی کہانیوں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ جو 'پربت کی بیٹی' کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے نظم میں فتنہ گر حسینہ کے جذبات اور اس کی جذباتی کیفیت کو مقید کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ہندی الفاظ کے استعمال نے ایک نرمی اور نزاکت کا احساس بھی پیدا کیا ہے۔

'آغازِ بہار' ایک بچی کی گل بدست تصویر کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ کل نو اشعار ہیں۔ پہلے سات شعروں میں مناظرِ فطرت کو بیان کیا گیا ہے۔ ہوا، رنگ و بو، ساحل، موجیں، ابر، گیت وغیرہ کا تذکرہ کر کے ایک ماحول بنایا گیا ہے۔ پھر آخری دو شعروں میں بچی کا ذکر کر کے پورے منظر کو ایک تصویر کی طرح سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

؎ اک طفل حسیں گل بداماں   آئینہ جبیں و فتنہ ساماں

مذکورہ بالا نظمیں حسرت نے کلکتہ کے دورانِ قیام میں لکھیں۔ ان ابتدائی نظموں میں حسن کی توصیف، حسنِ حقیقی کی مدح، کائنات کی بوقلمونی کا ذکر اور فلسفیانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ ایک اور نظم 'نیا زمانہ'

کے عنوان سے ملتی ہے۔ یہ لاہور کے زمانۂ قیام کی ہے۔ اس پر بھی فلسفیانہ تفکر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ حسرت کے خیال کے مطابق سب کچھ نیا ہونے کے باوجود پرانا ہے۔ اس نظم پر بھی اقبال کے اثرات واضح ہیں۔ تراکیب اور نظم کا مجموعی تاثر اور مزاج اقبال کی ابتدائی دور کی نظموں کی یاد دلاتا ہے۔ یہ نظم 'نیا زمانہ' اور 'انقلاب' کے دو مختلف عنوانات کے تحت شائع ہوئی۔ اس نظم میں بھی مناظرِ فطرت کا ذکر کر کے دنیا کو پرانا ثابت کیا گیا ہے۔ بزمِ کواکب، نمودِ سحر، جلوۂ شام، لذتِ قلب وجگر، ذوقِ طلب، فسونِ یاس سب کچھ پرانا ہے مگر ہم اس کو نیا سمجھتے ہیں۔

؎ مگر جو غور کرو تو یہ اک فسانہ ہے   طلسم دہر میں جو کچھ ہے سب پرانا ہے

غمِ زمانہ وہی فکرِ بیش و کم بھی وہی   ربابِ زیست وہی اس کا زیر و بم بھی وہی

لاہور آنے کے بعد ۱۹۳۱ء اور بعد میں کچھ عرصے تک جو نظمیں لکھی گئیں اُن میں فطری مناظر کے ساتھ تاریخی پس منظر میں اپنے خیالات و جذبات کی حرارت کی گئی ہے۔ لاہور آنے کے بعد حسرت کی سوچ اور فکر میں پختگی آچکی تھی۔ اُن کی طویل نظم 'کشمیر' کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر کو خطۂ کشمیر سے بے پناہ محبت تھی۔ اس موضوع پر انہوں نے دو سوا دو سو صفحے کی ایک کتاب بھی لکھی۔ اس نظم میں مناظرِ فطرت کے ساتھ ساتھ اپنی تاریخ دانی اور ادب آشنائی کا کمال بھی دکھایا ہے کہ اس سرزمین پر دودمانِ بابری اور خسروانِ ذی وقار خیمہ زن رہے لیکن اس خطّے کے باشندے علم و دولت سے تہی رہے۔ سطوتِ اسلام کے جو نشان تھے وہ سب مٹ گئے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

؎ کاش احساس عروجِ رفتگاں پیدا ہو پھر   اس زمیں سے ایک تازہ آسماں پیدا ہو پھر

یہ روایتی طرز پر لکھی گئی ایک نظم ہے۔ سترہ اشعار پر مشتمل یہ نظم نہایت زوردار اور کامیاب نظم ہے۔ اس نظم میں شکوہِ الفاظ ہماری توجہ سودا کے قصائد کی طرف لے جاتا ہے۔ نظم میں ایک فطری روانی اور آبشار کے سے بہاؤ کی کیفیت ہے۔ ماضی وحال کے موازنے نے نظم کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

نظم میں فارسی شعراء حافظ، قدسی، صائب، اور کلیم کا اس حوالے سے ذکر ہے کہ انہوں نے کشمیر جنت نظیر کی تعریف کی ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے اقبال کی نظم 'ہمالہ' کا خیال آتا ہے جس میں قدرتی مناظر وہی ہیں جو اس نظم میں ہیں۔ اور یہ نظم اسی بحر میں لکھی گئی ہے۔

چراغ حسن حسرت کی ایک نظم "ہسپانیہ کی گلفروش لڑکی" ہے۔ اکیس اشعار کی اس نظم میں ماضی وحال کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ایک لڑکی کا ذکر فطری مناظر کے پس منظر میں اس طرح کیا ہے کہ اس کا دلاویز سراپا آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ پھولوں، ستاروں اور نظاروں کے وسیلے سے مرکزی جذبے کو زبان عطا کی گئی ہے۔ اس کے بعد حسرت ہمسفر ہوتے ہوئے اس لڑکی سے مخاطب ہوتے ہیں اور اس کو اس کے عظیم الشان ماضی سے متعارف کراتے ہیں۔

لہو کس کا تیری رگوں میں رواں ہے — جبیں سے تری کس کی شوکت عیاں ہے
نگاہوں میں تیری جو جلوہ گر ہے — تجھے بھی خبر ہے یہ کس کا اثر ہے

پھر اس نظم میں سپانیہ کے باغوں، نہروں، فضاؤں، ہواؤں اور پہاڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔ عرب حکمرانوں کی عظمت وشجاعت اور شوکت وجلالت کی کہانی نہایت اثر انگیز انداز سے بیان کرتے ہیں۔

تھے ان میں شجاعت کے انوار سارے — تھے ان میں شجاعت کے آثار سارے
سمندر کی عظمت، ثریا کی رفعت — پہاڑوں کی شوکت، فلک کی جلالت

اس نظم میں مولانا حالی کی مسدس کا رنگ بھی موجود ہے،

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر — جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر

اور اقبال کے خیالات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے ع آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال۔

یہ نظم منظر نگاری، خوبصورت الفاظ و تراکیب، نادر تشبیہات اور رواں دواں بحر کی وجہ سے ایک بھرپور تاثر دیتی ہے°۔

ابتدائی دور کی نظموں میں حسرت نے فطری مناظر کے ساتھ اپنے خیالات وجذبات کو ہم آہنگ کر کے

° حسرت کو مسلمانوں کے عظیم الشان ماضی سے جو محبت تھی اس کا اظہار "تاریخ اسلام" لکھ کر کر چکے تھے۔ بچوں کے لئے ایک کتابچہ جو ہسپانیہ کی عظمتِ پارینہ پر روشنی ڈالتا ہے "شہزادہ عبدالرحمٰن" کے نام سے لکھا۔

بات میں زور بھی پیدا کیا ہے اور ایک فضا بنانے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ 'کشمیر' 'حسن ہسپانیہ کی گلفروش لڑکی' یا 'سرکھارٹ کی ایک رات' جیسی نظمیں حسرت کی فنی مہارت کی خوب صورت مثال ہیں۔

'کارخانۂ ہستی' کے نام سے ایک نظم رواتیی انداز میں ملتی ہے۔ اس میں مظاہرِ فطرت کا ذکر کیا گیا ہے جس ازل گل کے چراغ۔ چرخ نیلی فام۔ اور گل ولالہ کی تراکیب میں اقبال کی ابتدائی دور کی نظمیں یاد آتی ہیں۔

؎ زمیں کے فرش پہ گل کے چراغ روشن ہیں فروغ جلوہ سے لالے کے داغ روشن ہیں

یہ مہر و مہ، یہ ہجوم ثوابت و سیار یہ سبزہ و گل ولالہ یہ بارشِ انوار

چراغ حسن حسرت کی نظموں کے خزینے میں تین نظمیں ایسی بھی ہیں جو انگریزی سے منظوم ترجمہ ہیں۔ 'نغمۂ امید' (مصنف نامعلوم) 'محبت اور امید'۔ اور 'آخری پھول' یہ نظمیں ٹامس مور سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

'انجمنِ پنجاب' جس کا قیام ۱۸۶۷ء میں کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے جلسے منعقدہ ۱۵ اگست ۱۹۶۷ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے کہا تھا وہ شاعری میں نئے انداز کی خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں۔ کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں۔ اور ہمیں خبر نہیں، ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے؟ مولانا حالی اور آزاد کے لبعد اسماعیل میرٹھی، ظفر علی خاں، سرور جہاں آبادی، عظمت اللہ اور اقبال کے ہاں انگریزی سے منظوم تراجم ملتے ہیں۔ اس دور میں ہمایوں، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال، نگار، کارواں، اور دل گداز وغیرہ نے ترجمے کی اس روش کو آگے بڑھایا اس طرح سینکڑوں انگریزی نظموں کے ترجمے اردو میں منتقل ہو گئے۔

چراغ حسن حسرت انگریزی زبان میں درخور دانی رکھتے تھے۔ کئی انگریزی افسانوں کے کامیاب ترجمے کر چکے تھے۔ جنگِ عظیم دوم میں سنگا پور کے قیام کے دوران انگریزی صحافت کے طور طریقے اور مطالعے نے اُن کی انگریزی زبان سے واقفیت میں قابلِ رشک حد تک اضافہ کیا۔ اور حسرت کی اردو زبان پر قدرت اہلِ زبان کے لئے بھی قابلِ رشک تھی۔ ان دو زبانوں پہ اُن کی گرفت اور قدرت نے ترجمہ کرنے میں بڑی معاونت کی۔

'محبت اور امید' ٹامس مور کی نظم کا ترجمہ ہے۔ چوں کہ ٹامس مور کی یہ نظم پیشِ نظر نہیں ہے اس لئے ترجمے کے معیار اور مرتبے کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اشعار میں جو سلاست اور روانی

اور لفظوں کا خوب صورت چناؤ ہے اُس سے نظم کی خوبی ظاہر ہو رہی ہے۔

سمندر کے ساحل پہ صبح بہار ۔۔۔ بچھاتی تھی کرنوں کا زریں ستار

جہاں غرق تھا نورِ خورشید میں ۔۔۔ محبت تھی آغوشِ امید میں

دونوں اشعار میں "ر" کی تکرار موسیقی اور روشنی کا جو تاثر دے رہی ہے وہ اہلِ نظر پر عیاں ہے۔ سمندر پر شام کا چھا جانا کس رنز انگیز انداز سے بیان کیا ہے۔

اسی شغل میں ہو گیا دن تمام ۔۔۔ سمندر پہ لہرا گئی زلفِ شام

اسی طرح "نغمۂ امید" میں بھی لفظوں کی تکرار سے موسیقی کا تاثر دیا ہے۔ جو پڑھنے والے کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس نظم میں بے کیف گھٹائیں، بادِ خزاں، ویرانی، تاراج چمن، چشمِ شبنم آلود، حالِ زندگی، زرد پتیاں، کملائے پھول، کا ذکر کر کے ایک ایسا ماحول تخلیق کیا گیا ہے جو اداسی کا آئینہ دار ہے۔ ایک خزاں دیدہ منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ دفعتاً دو ایسے اشعار آتے ہیں کہ یہ الناک منظر بدل جاتا ہے۔

یہ دن بھی مگر نہیں رہیں گے ۔۔۔ یہ دورِ الم بھی مختصر ہے

یہ برگِ خزاں رسیدہ گویا ۔۔۔ اک عیدِ طرب کا نامہ بر ہے

اور پھر بڑی فن کاری سے بہارِ گل بداماں کا مژدۂ جانفزا سنایا ہے۔ یہ نظمیں اگرچہ ترجمہ ہیں لیکن بھرپور تاثر چھوڑتی ہیں۔ حسرت ان ترجموں میں کامیاب رہے ہیں۔

تیسری نظم "آخری پھول" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ ٹامس مور کی نظم ' TIS THE LAST ROSE OF SUMMER ' کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس نظم کے منظوم ترجمے بہت سے شعراء نے کیئے جن میں حسرت موہانی اور سرور جہاں آبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ حسرت موہانی کے ہاں زیادہ تر لفظی ترجمہ ہے لیکن چراغ حسن حسرت کے ہاں نظم کے مجموعی تاثر کو اردو کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ شاعر کے ہاں یاس کی کیفیت اور موسیقی کا تاثر دینے کی سعی کی گئی ہے اُس کو چراغ حسن حسرت نے بڑی مہارت سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ چراغ حسن حسرت کا منظوم ترجمہ ہر لحاظ سے دوسرے شعراء سے بہتر ہے۔ صرف حسرت موہانی کے ترجمے کا حوالہ بطور موازنہ دیا جاتا ہے۔

شاخِ گلبن میں جو ہے پھول کھِلا
بس یہی اک ہے چمن میں باقی
اور سب خاک میں مُرجھا کے مِلے
اب نہیں ایک بھی اس کا ساتھی (حسرت موہانی)

ہو چکا موسمِ بہار آخر
نغمۂ قمری و ہزار کہاں
منتشر پتیوں کو پھولوں کی
لے گئی ہے اُڑا کے بادِ خزاں (چراغ حسن حسرت)

چراغ حسن حسرت نے یاس کی کیفیت کو بھرپور طریقے سے بیان کیا ہے۔ حسرت کے یہ منظوم ترجمے، منظوم ترجموں کی تاریخ میں جگہ پا گئے ہیں۔

سیاسی نظموں کے بارے میں گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا ہے۔ چار نظمیں ایسی ہیں جو سیاسی پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں 'یونی نسٹ پارٹی کی شان میں چند ٹپے' 'چنا جور گرم' 'حرف وحکایت' اور 'جنگ نامۂ وزارت' ہیں۔ اوّل الذکر دو نظمیں اپنے زمانے کی بڑی معروف نظمیں تھیں، جن کا چرچا ایک زمانے تک سیاست کی وادیوں میں رہا۔ 'چنا جور گرم' اُس زمانے میں لکھی گئی جب میاں ممتاز دولتانہ اور میاں عبد الباری یکے بعد دیگرے صوبہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے۔ اس نظم سے اُس دَور کی مخصوص قسم کی سیاست کے نشیب و فراز کا علم ہوتا ہے۔ چوں کہ ان نظموں کا لہجہ عوامی تھا اس لئے زبان زدِ عام ہو گئیں۔

ے میرے چنے کا ڈھنگ نرالا اس کو کھائے قسمت والا
اس کے گاہک طرّے والے یعنی ہیپ ہیپ ہُرّے والا

'حرف و حکایت' اور 'جنگ نامۂ وزارت' طویل نظمیں ہیں۔ 'حرف وحکایت' میں کرسیٔ اقتدار کی

لڑائی کا ذکر ہے۔ مختلف سیاسی حریفوں کے داؤ پیچ کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ نظموں میں معروف شاعروں کے مصرعے اور اشعار بطور تضمین لاکر اُس کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔

؎ لیا دگی سے کام اٹھایا ہے۔ "شوق نے بات کیا بڑھائی ہے"

حسرت کی اہم ترین سیاسی نظموں میں 'جنگ نامۂ وزارت' ہے۔ یہ نظم ساقی نامے کی طرز پر مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں ۱۹۴۹ء کے زمانے میں جو سیاسی حالات تھے اُن کا ذکر طنزیہ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ سیاسی لیڈروں کی خود غرضی اور بے حسی کا پردہ چاک کیا ہے۔ واعظ، محتسب، مفتی و شیخ سب کارخانوں، دوکانوں، اور مکانوں کی فکر میں مبتلا دکھائے گئے ہیں۔

؎ چلیں حرص کی پالیسی پیش و پس ادہر بھی ہوس اور اُدہر بھی ہوس

سیاسی جنگ کا نقشہ جس دلچسپ طور اور طریقے سے بنایا گیا ہے اور جنگ کے متعلق الفاظ جس طرح نظم میں لائے گئے ہیں اُس سے نظم میں دلچسپی کا عنصر دوچند ہو گیا ہے۔ قدیم پہلوانوں کا ذکر جدید سیاسی اکھاڑہ بازوں کے ساتھ اس طرح کیا ہے کہ اُن کی اصلی صورتیں نمایاں ہو گئی ہیں۔

؎ کوئی ان میں لندھور کی یادگار کوئی رستم اور کوئی اسفند یار

کوئی ان میں پوتا ہے کاؤس کا بھتیجا سگا ہے کوئی طوس کا

سینتالیس[۴۷] اشعار پر مشتمل یہ نظم حسرت کی نہایت اہم نظم ہے۔ جس سے اُس زمانے کی سیاست کے ظاہر و باطن اور نشیب و فراز پر روشنی پڑتی ہے۔ اُس زمانے کے سیاسی مناظر آج بھی کسی نہ کسی روپ میں معروف عمل ہیں۔ حسرت نے اس نظم میں پیشہ ور سیاسیوں کی چالوں، بداعمالیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کا ذکر ہی نہیں بلکہ ایک مژدہ بھی سُنایا ہے جو ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔

؎ ہوا ختم جاگیرداری کا دور لُٹیرے کا دور اور لغاری کا دور

اُٹھو اور ان سے تیغ و سناں چھین لے وہ دونوں کے گرز گراں چھین لے

ڈاکٹر منیر آغا لکھتے ہیں "چراغ حسرت کی طنز بے محابا ہے اور اُن کے ترکش کے تیر سیاسی زندگی کی سرناہمواری کو اپنا نشانہ بنا لیتے ہیں[۲۶]"

حسرت نے پاکستان کی سیاسی کشمکش کا بطور صحافی ایک طویل دور دیکھا ہے۔ بدلتے ہوئے واقعات و حادثات

اور سانحات اور نت نئی سیاسی چپقلشوں پر اپنے مخصوص طنزیہ و مزاحیہ انداز سے نظم و نثر میں اظہار خیال بھی کیا ہے۔

اس طرز کی نظمیں مجید لاہوری کے ہاں بھی ملتی ہیں لیکن وہ علمی پس منظر جو حسرت کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے اُن میں نہیں۔ حسرت نے تفنن اور وسیع ادبی و شعری روایات سے فائدہ اٹھایا ہے اور اُن کی یہ نظمیں ادب و صحافت کی دنیا میں ایک مستقل مقام حاصل کر گئی ہیں۔

جدید نظم پر تنقید کرتے ہوئے حسرت نے تین نظمیں لکھی ہیں۔ حسرت چوں کہ روایت پسند شخص تھے اس لیے وہ جدید قسم کی شاعری کے معترض و مخالف تھے۔ چنانچہ اس کے متعلق انہوں نے پیروڈیاں لکھیں۔ آزاد شاعری کے بارے میں حسرت کے طنزیہ رویے کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ ابھی تک آزاد شاعری کے بڑے فن پارے پیدا نہیں ہوئے تھے اس لئے موصوف کے شکوک بجا تھے۔ پھر چوں کہ وہ کلاسیکی ذوق و ذہن رکھتے تھے اور غزل کے دلدادہ تھے اس لئے انہوں نے شروع میں جدید نظم (نظم آزاد) کا مذاق اُڑایا۔ حسرت شعر کو معمّہ نہیں سمجھتے تھے اور نہ بنانا چاہتے تھے اس لئے بھی وہ آزاد نظم کے ابہام و اشاریت کے خلاف ہو گئے۔ البتہ اگر کسی نے نئی شاعری کے تجربوں میں سنجیدگی سے حصّہ لیا جیسے کہ ن م راشد تو حسرت نے اُن کی تحسین بھی کی۔

'ادبی دنیا' میں میراجی کی ایک نظم 'جو ہوتا ہے' شائع ہوئی تو اس نظم کے تتبع میں ایک نظم 'شیرازہ' یکم فروری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی جو حقیقت میں میراجی کی نظم کی پیروڈی ہے لیکن اس نظم کے آخری بند میں شاعر نے (دوزخی) نے وہ بات لکھی ہے جو اس چیز کی غماز ہے کہ کچھ لوگ نئے تجربوں کا مذاق کیوں اُڑا رہے تھے۔

مگر میں تو شاعر ہوں لکھتا ہوں نظمیں
جنوں خیز الفاظ معنی نہ مطلب
عجب اُن کی بحریں ہیں بندش ہے بیڈھب
یہ پنجاب والے کہاں ان کو سمجھیں
کہیں دُور صحرائے اعظم کے اندر

مجھے دے رہی ہیں سُنائی

صدائیں کسی کی

کہ ہاں میرے پیارے کہے جا، کہے جا، یہ شعر ہیں کہ جن کو سمجھتے ہیں وحشی

خبر ہے جنہیں تال کی اور نہ سُر کی ۔

اس پس منظر اور وجوہات کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ حسرت نے آزاد نظم کا مذاق کیوں اڑایا۔ موصوف کی یہ نظم :

چٹھیں لکھتے تھے جب اخبار میں ہم

تو مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

جب چھپی تو (یکم ستمبر ۱۹۴۰ء) حسرت نے ترقی پسند شاعری پر ایک دلچسپ نوٹ لکھا۔ جدید نظم کا مذاق اڑانے کے بعد لکھتے ہیں :

"یہ بے قافیہ شاعری، یا باصطلاحِ عام جدید شاعری بھی عجیب شے ہے اور اگر راشد کی نظموں کو نکال دیا جائے تو اس صنف میں کام کی چیزیں بہت کم رہ جاتی ہیں"

اس نوٹ کے بعد مذکورہ بالا نظم پیش کی گئی ہے ۔ نوٹ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حسرت بلاوجہ جدید شاعری کے مخالف نہیں تھے بلکہ اُس رویّے کے مخالف تھے جو بے قافیہ شاعری میں در آیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے زمانے میں جب نظم آزاد اور بے قافیہ نظم اپنے عروج پر تھی بڑے بڑے شعراء کی دیکھا دیکھی ہر کوئی اس صنف میں طبع آزمائی کر رہا تھا - حسرت جیسے ثقہ، کلاسیکی ذوق رکھنے والے شخص کو اس قسم کی شاعری کیوں کر پسند آ سکتی تھی ۔ انہوں نے پے در پے نثر اور نظم میں اس رویّے کو اپنا نشانہ بنایا اور آزاد اور بے قافیہ نظمیں لکھیں ۔ یہ نظمیں نہایت لطیف طنز سے سربز ہیں اور پڑھنے والے کو ایک ادبی سرخوشی سے بہرہ یاب کرتی ہیں ۔ 'جدید شاعری' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اُس میں جدید شاعری کے بے ربط خیالات، بے مقصد الفاظ، اور بے جوڑ تراکیب کا مذاق اڑایا ہے ۔ اس نظم کے مطالعے سے بے ساختہ ہنسی چھوٹ جاتی ہے ۔

گراں مایہ جوانی !!!

کبھی شکر کی تلخی ، اور کبھی حنظل کی شیرینی

کبھی کرنوں کی تاریکی ، کبھی ہے نور ظلمت کا

کبھی کدو ، کبھی شلغم ، کبھی خرفہ ، کبھی مولی

کبھی ہے ساگ پالک کا ۔

اِن نظموں میں حسرت کا وہ مخصوص مزاح ظاہر ہوا ہے جو اُن کی روزانہ کی کالم نویسی میں تھا ۔

چراغ حسن حسرت کی نظموں میں ایک آدھ فرمائشی نظم بھی ملتی ہے ۔ فی البدیہہ شعر کہنا مولانا ظفر علی خاں کا مزاج تھا ۔ حسرت نے اس دور کے اثرات بھی قبول کیئے ۔ ایک مختصر نظم جو عطاء اللہ شاہ بخاری کی فرمائش پر سنائی گئی تھی ، غزل کا انداز لیئے ہوئے ہے ۔ مضامین اور لہجہ بھی غزل ہی کا ہے لیکن ہیئت نظم کی ہے ۔ ایک شعر ہے :

؎ جوانی آئی اور سیکھا ادا نے فتنہ گر ہونا تری ترچھی نظر کو آگیا ، حرفِ نظر ہونا

ایک نادر نظم مسعود کی شادی پر ہے ۔ روایتی سہرے کے انداز سے ہٹ کر لکھی گئی ہے ۔ موقع کی مناسبت سے حسرت نے ایسے پُر مسرت شعر لکھتے ہیں جو مسرت و انبساط کی کیفیت کو ابھار رہے ہیں ۔ اس نظم میں حسرت کا وہی مزاح میں ڈوبا ہوا رنگ جھلکتا ہے جو اکثر و بیشتر اُن کی نثری تحریروں میں نظر آتا ہے ۔

حسرت نے ایک آدھ نظم نجی قسم کی بھی لکھی ہے ۔ جیسے "منظوم رسید" اس میں مزاحیہ رنگ غالب ہے ۔ یہ نظم فی البدیہہ لکھی گئی تھی ۔ اس کی لفظیات تمام تر غزل کی ہیں ۔ یہ نظم اُس طرز کی ہے جس قسم کی نظم مولانا ظفر علی خاں نے علامہ اقبال کے ہاں سے "کھیس" ملنے پر لکھی تھی ۔ اُس نظم کا ایک شعر ہے ۔

؎ جو اپنی ہیوی کھیس زمیندار کو کھلائے دو دھوں نہائے ڈاکٹر اقبال کی وہ گائے

حسرت نے لکھا ؎ نہیں دھان میں ایک چاول کا دانہ صراحی ملی ہے یہ خالی ملی ہے

چراغ حسن حسرت، مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ بھی کام کرتے رہے اور اُن کے معترف ومداح بھی تھے۔ اس لئے اُن کے اثرات یقیناً قبول کئے ہوں گے۔

نظموں کی ذیل میں حسرت کا ایک نہایت کامیاب اور معروف گیت بھی آتا ہے۔ یہ گیت اردو گیتوں میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اردو کا پہلا ماہیا ہے جو حسرت کے قلم سے نکلا اور ایک شہ کار کا درجہ پاگیا۔ ماہیا پنجابی زبان کی صنف ہے اس میں شاعر کسی خارجی کیفیت کا حوالہ دے کر داخلی کیفیت بیان کرتا ہے۔ اس کو دو سخنہ بھی کہا جاتا ہے۔

حسرت کا یہ ماہیا ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ اردو میں بالکل نئی چیز تھی اس کی پیروی میں کچھ اور شعراء نے بھی طبع آزمائی کی۔ جیسے اختر شیرانی نے کچھ ماہیے لکھے لیکن جو شہرتِ دوام حسرت کے اس ماہیے کو حاصل ہوئی وہ آج تک کسی کے حصّے میں نہیں آئی۔

باغوں میں پڑے جھولے

تم بھول گئے ہم کو، ہم تم کو نہیں بھولے

حسرت نے اِن ماہیوں میں محبّت کے لطیف جذبات کو بیان کرکے ایک ایسی فضا قائم کی ہے جس میں سر جانے والا اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتا ہے اور اُسے یہ کہانی اپنی ہی کہانی محسوس ہوتی ہے۔

چراغ حسن حسرت کے کلام میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ چند رباعیات بھی ملتی ہیں۔ یہ رباعیات حمدیہ اور نعتیہ ہیں۔ اِن میں خالصتاً مذہبی رنگ جھلکتا ہے۔ رباعی کے موضوعات میں حمد، بے ثباتیٔ دنیا، یادِ رفتگاں، خودداری اور انقلابِ زمانہ وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ حسرت کی رباعیات میں دو حمدیہ ہیں اور تین کا نعتیہ رنگ ہے۔

یہ رباعیات حسرت کے ابتدائی زمانے کی ہیں۔ جب اُن پر فطرت سے قربت، متفکرانہ سوچ اور ابتدائی مذہبی و ادبی ماحول کا رنگ نمایاں تھا۔ اِن رباعیات میں حالی اور اکبر کا پرتو ملتا ہے۔ مثلاً

اس نورِ مبیں سے این و آں روشن ہیں ۔۔۔ روشن ہیں، زمین و آسماں روشن ہیں

ہیں جلوہ فروز بزمِ کونین حضور ۔۔۔ اک شمع سے یہ دونوں مکاں روشن ہیں

ان رباعیات سے حسرت کے ذہنی ارتقاء کا پتہ بھی چلتا ہے اور ابتدائی زمانے میں اُن کی سوچ اور فکر پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔

آخر میں حسرت کی ایک نظم "او دیس سے آنے والے بتا" جو اختر شیرانی کے تتبع میں کہی گئی ہے ، کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ حسرت نے اکثر مقامات پر اپنے آبائی وطن پونچھ کا ذکر نہایت چاہت کے ساتھ کیا ہے ۔ موصوف نے پونچھ کے شناساؤں ، راتوں ، دنوں ، پیہڑوں ، بھیڑوں اور اپنے بچپن کے دوستوں کا ذکر کیا ہے ۔ ماضی کی دلچسپیوں اور ماحول کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔ نظم کشمیر میں وہ وہاں کی غربت اور جہالت کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس نظم میں سرکار کا کسانوں سے مالیہ وصول کرنا اور تحصیل کے پیادوں سے تکرار کا ذکر کیا ہے ۔ حسرت اپنے وطن کی خوب صورت فضاؤں اور ہواؤں کے تذکرے کے ساتھ عوام پر ہونے والے ظلم و ستم کا اظہار بھی دردناک پیرائے میں کرتے ہیں ۔

غزل کے جائزے کے دوران کسی مقام پر فیض احمد فیض کی حسرت سے اثر پذیری یا مماثلت کا ذکر آیا ہے ۔ اس نظم میں حسرت کے جب یہ مصرعے سامنے آتے ہیں :

کرتی ہے وصول کسانوں سے کیا مالیہ سرکار اب کہ نہیں
تحصیل کے پیادوں سے ہوتی رہتی ہے تکرار اب کہ نہیں

تو فیض کی ایک پنجابی نظم کے مصرعے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں :

کتنے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتنے دھاندلی مال پٹوار دی اے

اس نظم کا ایک بند خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں حسرت نے بڑے معصوم انداز میں بچوں کی طرح دیس سے آنے والوں سے استفسار کیا ہے ۔

نجّو کی اماں کیسی ہے ، منّو کی بٹیا کیسی ہے
جُمّے کی بھینس کا حال ہے کیا ، رُسلے کی بچھیا کیسی ہے
مولی کا طوطا کیسا ہے ، ملکوں کی مینا کیسی ہے

او دیس سے آنے والے بتا ۔ ۔ ۔ ۔

چراغ حسن حسرت کی نظموں کے جائزے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ غزل کی طرح نظم کہنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ابتدائی زمانے کی نظموں میں تفکر، فطرت سے قربت کا رنگ نمایاں ہے۔ اُن کی ابتدائی دور کی نظموں میں اقبالؔ کا رنگ اور اثر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اُن کی سیاسی نظموں میں طنز و مزاح کا رنگ تو ہے اس کے ساتھ اُس زمانے کی سیاست اور سیاستدانوں کے بارے میں قیمتی معلومات ملتی ہیں۔ وہ نظمیں جن میں محبت کے لطیف جذبات کو موضوع بنایا گیا ہے اُن میں موسیقی، روانی اور اظہار پر گرفت نمایاں ہے۔

منظوم ترجمے بھی نظموں کے اس ذخیرے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمے کے فن میں حسرت کو کس قدر مہارت حاصل تھی۔

'کشمیر'، 'تصویر دیکھ کر'، 'ہسپانیہ کی گلفروش لڑکی' بڑے سحر کی نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ 'ایک گیت' اور 'خنگ نامہ وزارت' جیسی نظمیں اردو شاعری میں ممتاز مقام کی حامل ہیں۔

چراغ حسن حسرت ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نثر کی ہر صنف پر قادر تھے اور شاعری کے ہر کوچے سے واقف و آشنا تھے۔ غزل، نظم، طنز، تحریف نگاری میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ نثر میں بچوں کے لئے انہوں نے کئی کتابچے تحریر کئے جو متفرق موضوعات کو محیط تھے۔ اُن کی زبان، معلومات اور دلچسپی کا عنصر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔

حسرت نے بچوں کے لئے بھی کئی نظمیں لکھیں جو بچوں کے ادب میں اپنا ایک مقام اور مرتبہ رکھتی ہیں۔ یہ گیارہ نظمیں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئیں۔ ایک نظم "تہذیبِ نسواں"* ۲ جولائی ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ باقی تمام نظمیں "پھول"° میں شائع ہوئیں۔

حسرت کے اپنے زمانے میں علامہ اقبالؒ کے علاوہ کئی دوسرے ادیب بھی بچوں کے لئے قابلِ قدر تصانیف پیش کر رہے تھے جن میں حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، اختر شیرانی، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، راجہ مہدی علی خاں، اور مجید لاہوری وغیرہ اہم ہیں۔

اس زمانے میں ہر ادیب بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھ رہا تھا۔ اور کئی مؤقر رسالے بچوں کے لئے شائع ہو رہے تھے، یا ادبی رسائل کے کچھ اوراق بچوں کے لئے مخصوص تھے۔ حسرت جب رسالہ "تہذیبِ نسواں" اور پھول کے ساتھ منسلک ہوئے تو انہوں نے کئی نظمیں بچوں کے لئے بھی تحریر کیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں "پھول" کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ بچوں کی ذہنی، علمی، اخلاقی تربیت کے لئے اس رسالے نے اہم کردار ادا کیا۔ پھول ایک ایسا ادارہ تھا جو مختلف ادیبوں کی تربیت کرتا تھا کہ بچوں کے لئے کیسے اور کس قسم کی زبان میں لکھا جائے۔

چراغ حسن حسرت "پھول" سے منسلک ہوئے تو اُن کی نظر میں وہ ساری روایت موجود تھی جس کی روشنی میں بچوں کے لئے اعلیٰ درجے کی تحریریں پیش کی جا رہی تھیں۔ بغیر کسی مقصد یا جذبے

---

* "تہذیبِ نسواں" ۱۸۹۸ء میں محمدی بیگم نے اپنے خاوند سید ممتاز علی کے ساتھ مل کر نکالا۔

° "پھول" ۱۹۰۸ء میں محمدی بیگم نے جاری کیا جو ۱۹۵۷ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔

سے کچھ تحریر کرنا نہ تو تاثر و تاثیر رکھتا ہے اور نہ ہی اُس میں یہ قوت ہوتی ہے کہ دوسروں کو ملتفت کر سکے۔ حسرتؔ خود بھی معصوم سی شخصیت کے مالک تھے اور بچوں سے بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ موصوف نے اپنے بیٹے ظہیر الحسن، جس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی کے گم ہو جانے پر جس ردِ عمل کا اظہار کیا اور جس طرح اُسے تلاش کرنے میں زمین و آسمان ایک کر دیئے اُس سے اُن کی محبت کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسی محبت جو صرف اپنے بچوں کے لئے ہی نہیں سب بچوں کے لئے وقف تھی۔

"بچوں کے واسطے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں" حسرتؔ نے بچوں کے لئے جو کچھ لکھا خواہ نثر میں ہو یا نظم میں اُس میں ایک معیار کو برقرار رکھا۔ اُن کی تحریروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بچوں کے لئے لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ زبان و بیان کی شگفتگی، دل کشی، روانی، ترنم کا ہر جگہ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ہر وہ تحریر جو بچوں کے لئے لکھی جا رہی ہے اُس میں بچوں کے ذہن، سوچ اور اُن کی نفسیات کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔

حسرتؔ کی نظمیں پڑھ کر کہیں بھی بے جا مبالغے یا مشکل پسندی کا احساس نہیں ہوتا۔ انہوں نے ہمیشہ بچوں کی سطح پر بات کی، اُن کی نفسیات اور پسند کو ملحوظ رکھا۔ اِن نظموں میں معلومات، مشاہدات اور دل کو موہ لینے والی کہانیاں بھی ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہیں اور بچوں کے بھولے بھالے سوالات بھی اور اُسی زبان میں اُن کے جوابات بھی ہیں۔

'پھول' کی سال گرہ پر ایک نظم ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس رسالے کی آمد پر بچے کس طرح خوشی کا اظہار کرتے ہیں:

سال گرہ نمبر کو لے کر   خوش پھرتے ہیں اندر باہر
ننھے ننھے لڑکے بالے   پیارے پیارے بھولے بھالے
یہ خوش ہیں تو دنیا خوش ہے   اماں خوش ہیں، بادا خوش ہیں

بچوں کی تعلیم اور اُن کی معلومات میں اضافے کی خاطر ایک خوب صورت نظم 'پنجاب کے میدان' ہے۔ جس میں میدانوں، کھیتوں، فصلوں، جھیلوں، صحراؤں، جنگلوں، اور نہروں کا دل کش نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نظم میں چھوٹے چھوٹے مصرعے ہیں۔ رواں دواں بحر ہے جو بچوں کے مزاج کے عین

مطابق ہے۔ اس نظم میں نہایت سادگی سے بچوں کے لئے معلومات اور دلچسپی کی چیزیں رکھ دی گئی ہیں۔ اس قسم کی نظمیں زبان و بیان پر گرفت کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اور یہ چیز حسرت میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مولانا ماہر القادری نے بجا لکھا ہے کہ "بچوں کے لئے نظمیں کہنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ دشوار کام ہے۔ اس فرض سے وہی شاعر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو ایک طرف بچوں کی نفسیات سے باخبر ہو اور دوسری طرف زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو۔ یہ صنف درحقیقت رنگ گل اور حبابوں کی نازک کارگاہ ہے[۲۸]۔"

'پنجاب کے میدان' نظم کے چند شعر دیکھئے:

ہر سمت ہیں بہاریں ہر سمت نظارے
پیڑوں کی قطاریں چشموں کے کنارے
ڈھوروں کو چراتے پھرتے ہیں گوالے
رکھتے ہیں عجب شان پنجاب کے میدان

چراغ حسن حسرت نے نظموں کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو بچوں کے ذہن سے ہم آہنگ اور ان کی ذہنی دنیا سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسے موضوعات جن میں بچوں کے ساتھ بڑے بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ جیسے 'راوی کے کنارے' 'آؤ ہم بن جائیں تارے' وغیرہ۔ ثانی الذکر نظم ایک گیت کی صورت میں لکھی گئی ہے جسے بچے مل کر گاتے ہیں اس میں آہنگ اور ترنم کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

بادل آئے دھوم مچاتے لے کر کالے کالے چھاتے
آؤ ہم بھی دھوم مچائیں اُن کے پردوں میں چھپ جائیں
آؤ آنکھ مچولی کھیلیں
مل کر سب ہم جولی کھیلیں

چھوٹے چھوٹے مشاہدات سے دنیا میں بڑے بڑے انکشافات ہوئے ہیں۔ حسرت نے اپنی نظموں میں کائنات کے مشاہدے پر بہت زور دیا ہے۔ بچے کائنات میں بکھری ہوئی چیزوں کے بارے میں سوالات

کرتے ہیں پھر ماں، باپ، بہن بھائی، دوست یا استاد اُن کے جوابات دیتے ہیں۔ چیزوں کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں وہ جاننا چاہتے ہیں۔ حسرت نے خود بچہ بن کر مختلف چیزوں پر اظہارِ حیرت کیا ہے۔ ایک معصومیت، حیرت اور استعجاب بچے کے چہرے سے عیاں ہوتا ہے، بچے کے اندر جستجو کا یہ مادہ انہیں علم کی نئی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ حسرت اِن سب چیزوں سے واقف ہیں۔

اچھی امی! یہ آسماں کیا ہے؟ — چاند کیا چیز ہے کہکشاں کیا ہے؟
ننھے تارے کہاں سے آتے ہیں؟ — خوف سے کس کے تھرتھراتے ہیں؟
کون سے مدرسے میں پڑھتے ہیں؟ — کس طرح آسماں پہ چڑھتے ہیں؟

آخری شعر میں جو سوال کیا گیا ہے یہ سوال بچے کے علاوہ اور کون کرسکتا ہے۔ نظم لکھتے ہوئے بچہ بن جانا ہی شاعر کا کمال ہے۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"یہ ضروری نہیں کہ ہر اچھا شاعر بچوں کے لئے بھی اچھی نظمیں لکھ سکے۔ بچوں کا شاعر بننے کے لئے جہاں اچھا شاعر ہونا ضروری ہے وہاں مزاج میں طفلانہ معصومیت و حیرت، طبیعت میں نرمی اور گداز اور بیان کی روانی اور زبان کی سلاست بھی ناگزیر ہے۔ بچوں کے لئے نظمیں کہتے ہوئے بچہ بن کر سوچنا پڑتا ہے اور بڑی عمر کے سب شاعر بچوں کے شاعر نہیں ہوتے۔"[۲۹]

چراغ حسن حسرت اچھے شاعر تو تھے ہی اُن میں طفلانہ معصومیت، طبیعت میں نرمی و گداز، بیان میں روانی اور تحریر میں سلاست کے جوہر موجود تھے۔ ایسا شخص ہی بچوں کے لئے بطریقِ احسن نظمیں لکھ سکتا ہے۔ بچوں کی نفسیات سے واقفیت اور اُن کے لطیف خیالات سے آشنائی نہایت مشکل کام ہے۔ اسکول میں بچوں کا پہلا دن خوف و ڈر، واقفیت و عدم واقفیت، گھر سے دوری کا غم جیسی ملی جلی کیفیات رکھتا ہے۔ اس کا اظہار حسرت نے 'پہلا دن' والی نظم میں نہایت خوبی و صفائی اور فن کاری سے کیا ہے:

ننھی پڑھنے آئی ہے — شبیریں بھی لائی ہے
ننھا دل اور ننھا سن — اور اسکول کا پہلا دن
کتنی بھولی بھالی ہے — دل فکروں سے خالی ہے
نقشہ ہے اسکول کا اور — یاد آتے ہیں گھر کے طور

بچہ جب اسکول کو اپنے گھر سے مختلف پاتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور یہی وہ معصوم پریشانی ہے جس کو اچھا شاعر پڑھ لیتا ہے۔ اور اُس کو خوب صورت الفاظ کا رنگ برنگ لباس دے دیتا ہے۔

پرندوں، جانوروں، کیڑوں مکوڑوں سے بچوں کی دلچسپی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اُن کو اپنے جیسا خیال کر کے اُن سے باتیں کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ یہ ہماری باتیں سنتے ہیں اور اُن کا جواب دیتے ہیں۔ کبوتروں، بلبلوں اور مرغیوں سے بچوں کے خاص مراسم ہوتے ہیں۔ حسرت کی ایک نظم "ننھی اور بلبل" میں ایک بچی کو بلبل سے باتیں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہی معصوم باتیں، دلچسپ خواہشیں سب بلبل سے وابستہ کر دی ہیں اور کہہ رہی ہے:

اُڑ کر پیڑ سے آجا بلبل   مجھ کو گیت سُنا جا بلبل

گھر اپنے لے جاؤں گی   تجھ کو ساتھ سلاؤں گی

اچھے اچھے کھلونے دوں گی   گڑیا بھی تجھ کو دے دوں گی

حسرت نے اپنی نظموں میں اکثر اُن چیزوں کا ذکر کیا ہے جو بچوں کے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث ہوں، یا ہوتی ہیں اور اُن کی ارد گرد کی دنیا سے تعلق رکھتی ہوں۔ جیسے پرندے، درخت، ستارے، جگنو، دن رات، پھول، امی، ابا، سلمون، پانی، مٹی وغیرہ۔

حسرت کی اِن نظموں کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بچوں کی نفسیات کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے۔ اُن کی پسندیدہ مشاغل اور رجحانِ طبع کو سامنے رکھ کر نظمیں لکھی ہیں۔ بچوں کو زبان سکھانے کے لئے کچھ ذخیرۂ الفاظ بھی فراہم کیا ہے۔ بچوں کو معلومات بہم پہنچانے کے لئے اور نئی چیزوں کی طرف راغب کرنے کے لئے بھی اِن نظموں میں دھیان دیا گیا ہے۔ نظمیں ایسی بحور میں ہیں کہ اُن کا آہنگ بچوں کو متوجہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن لکھتے ہیں:

"حسرت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے نظمیں نہایت سادہ اور سہل انداز میں لکھی ہیں۔ بحریں بھی چھوٹی استعمال کی ہیں جو نہ صرف مترنم ہوتی ہیں بلکہ اس میں کہی ہوئی نظم بچوں کو بہت جلد یاد بھی ہو جاتی ہے۔"[30]

بچوں کے لئے لکھی گئی حسرت کی اِن نظموں کی تعداد اگرچہ مختصر ہے لیکن اگر نظموں کے فنی محاسن پر نظر ہو تو یہی مختصر نظمیں بچوں کے ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

چراغ حسن حسرت کی شعری تخلیقات کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل اور نظم ہر دو اصناف پر قدرت رکھتے تھے اور زبان و بیان کے مختلف وسیلوں پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ حسرت نے شاعری میں کلاسیکل روایات کو برقرار رکھا۔ متقدمین شعراء کے بہترین عناصر کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ ایک نئے اور جاذب توجہ اسلوب کی صورت دی۔ وہ اُن شعراء سے متاثر بھی ہوئے اور اپنے ذوق کی آبیاری بھی کی، اس طرح حسرت کی شاعری میں ایک خوبصورت تاثر اور تاثیر نے جنم لیا۔

حسرت کو شاعری کی روایت پر چوں کہ کامل عبور حاصل تھا اس لئے کلاسیکی غزل کے عمدہ و اعلیٰ عناصر ایک حسین امتزاج کے ساتھ اُن کی غزل میں در آئے ہیں۔ باوجودیکہ اُن کا کلام محدود ہے لیکن باعتبار خوبی و نفاست اُن کی غزل قابلِ توجہ اور لائقِ التفات بن گئی ہے۔

حسرت کی غزل میں پیچ و خم یا ابہام کی بات نہیں تھی بلکہ سیدھے سادے انداز میں وارداتِ قلب و نظر کا بیان ہے جو دل و دماغ کو آسودہ بھی کرتا ہے اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ اُن کا اسلوبِ فکر دل آویز اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔

چراغ حسن حسرت نے اپنی غزل میں روایت کو ملحوظ خاطر تو رکھا ہی ہے اس کے ساتھ جدت طرازی کی روش بھی اپنائی ہے۔ انہوں نے غزل میں موسیقی کے اسرار و رموز سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ غزل میں گوناگوں قلبی کیفیات کو سمو کر اُسے لازوال بنا دیا ہے۔

اُن کی غزل میں سلاست ایک ایسی چیز ہے جو فوراً متوجہ کرتی ہے۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جس سے اُن کے بیشتر معاصرین محروم تھے، زبان کی شگفتگی اور بیان کی گھلاوٹ نے اُن کی غزل کو رعنائی اور ایک لطافت آمیز سادگی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ غزل میں زبان و محاورہ کا خیال اور اہتمام اُن کے لئے مذہب کا حکم رکھتا ہے۔ زبان اور جذبے کی ہم آہنگی اُن کے کلام میں قابلِ غور ہے۔

حسرت کی غزلوں کے پس منظر میں سارے کلاسیکی ادب کی پرچھائیں مسلسل نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے قدیم اسالیبِ غزل میں جدید رنگ شامل کر کے اُسے حسین تر بنا دیا ہے۔ اور یہی

چیز اردو شاعری میں اُن کو ایک مقام اور مرتبے کا حق دار بناتی ہے۔

حسرت کی غزلوں کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کلاسیکی رچاؤ، زبان کی شیرینی، خیال کی سادگی اور شگفتگی، جذبے کی صداقت و طہارت، غنائی کیفیت، لفظ و معنی کا خوبصورت پیوند، اور دل کو چھو لینے والی خاص قسم کی نغمگی و موسیقیت اس توازن اور اعتدال کے ساتھ سامنے آتی ہے جس نے انہیں اردو شعراء کی صف میں ایک اہم مقام عطا کردیا ہے۔

چراغ حسن حسرت کی نظموں کے جائزے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ غزل کی طرح نظم کہنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی نظموں میں تفکر بھی ہے اور بات کہنے کا سلیقہ بھی۔ موضوع کے مطابق پیرایۂ اظہار نے بھی نظموں کی اہمیت میں اضافہ کردیا ہے۔ حسرت کی تاریخ شناسی نے بعض نظموں کو مستقل اہمیت دے دی ہے۔ سیاسی پس منظر میں لکھی گئی نظموں میں اُس دور کی سیاست کے بارے میں قیمتی معلومات ملتی ہیں۔ مزاحیہ نظمیں اپنے مخصوص موڈ اور فضا کی بنا پر دلچسپی اور شگفتگی کے عناصر کو لیے ہوئے ہیں جو اہتزاز کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ جن نظموں میں محبت کے لطیف جذبات کو موضوع بنایا گیا ہے اُن میں موسیقی، روانی، اور اظہار پر گرفت نمایاں ہے۔ اس طرح یہ نظمیں بھی ادب و شعر میں مستقل اہمیت کی حامل قرار پائیں گی۔

حسرت کی شاعری کا جو بھی حصّہ فراہم ہوکر ترتیب و تدوین کے مرحلے کے بعد یکجا صورت میں سامنے آتا ہے اُس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ قادر الکلام تھے اور فکری و فنی نقطۂ نظر سے اُن کی شعری تخلیقات تاریخِ ادب میں وقیع اضافے کا باعث بنیں گی۔

حوالہ جات

۱۔ شورش کاشمیری، نورتن، لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۶۷ء ص ۹۷ ۔

۲۔ اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم، دہلی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء ص ۳۹ ۔

۳۔ ایضاً ص ۴۲ ۔

۴۔ ساحل احمد، غزل پس منظر، پیش منظر، الہ آباد، اردو رائٹرز گلڈ، دسمبر ۱۹۷۶ء ص ۱۳ ۔

۵۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن (مرتب)، جدید اردو غزل، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء ص ۴۳ ۔

۶۔ چراغ حسن حسرت، مُردمِ دیدہ، لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۹ء ص ۱۷ ۔

۷۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۸ جون ۱۹۵۵ء ۔

۸۔ آفتاب، کلکتہ، مئی ۱۹۲۷ء ص ۳۱ ۔

۹۔ صادق، میرپور آزاد کشمیر، جولائی ۱۹۷۷ء ص ۱۶ ۔

۱۰۔ چٹان، لاہور، ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء ص ۴ ۔

۱۱۔ صادق، ص ۱۶ ۔

۱۲۔ مضامین حسرت، ص ۸ ۔

۱۳۔ نورتن، ص ۹۶ ۔ ۹۷ ۔

۱۴۔ شیرازہ، لاہور، ۱۶ جولائی ۱۹۳۷ء

۱۵۔ اختر حسین رائے پوری، گردِ راہ، کراچی، مکتبۂ افکار، ۱۹۸۴ء ص ۶۳ ۔

۱۶۔ غزل پس منظر، پیش منظر، ص ۲۳۲ ۔

۱۷۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، لاہور، مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء ص ۲۳۹ ۔

۱۸۔ نیرنگِ خیال، لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۲۵۶ ۔

۱۹۔ ن۔م۔ راشد، ماورا، جولائی ۱۹۴۱ء

۲۰۔ رشید احمد صدیقی، جدید اردو غزل، لاہور، یونیورسل بکس ۱۹۸۷ء ص ۳۹

۲۱۔ نورتن، ص ۹۷

۲۲۔ صادق ص ۱۶

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ امروز ، لاہور ، ۲۶ جون ۱۹۵۶ء ص ۵

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا ، اردو ادب میں طنز و مزاح ، لاہور ، اکادمی پنجاب ٹرسٹ ، ۱۹۵۸ء ص ۳۵۸ ۔

۲۷۔ ساقی جوبلی نمبر کراچی ، ۱۹۵۵ء ص ۱۶۱ ۔

۲۸۔ عابد نظامی ، میٹھے بول ، لاہور ، مکتبۂ تعمیرِ انسانیت ، ۱۹۶۷ء ص ۷

۲۹۔ ایضاً ص ۹

۳۰۔ محمود الرحمٰن ، اردو میں بچوں کا ادب ، کراچی ، نیشنل پبلشنگ ہاؤس ، ۱۹۷۰ء ص ۲۵۲ ۔

کتابیات

کتابیات

۱۔ اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم، دہلی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء -

۲۔ اختر حسین رائے پوری، گردِ راہ، کراچی، مکتبۂ افکار، ۱۹۸۴ء -

۳۔ اے۔ حمید، یادوں کے گلاب، لاہور، مکتبۂ عالیہ، ۱۹۸۸ء -

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، کراچی، مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۷ء

۵۔ حسرت، چراغ حسن، حیاتِ اقبال، لاہور، تاج کمپنی، س۔ن

۶۔ حسرت، چراغ حسن، اقبال نامہ، لاہور، تاج کمپنی، س۔ن

۷۔ حسرت، چراغ حسن، پربت کی بیٹی، لاہور، اردو اکیڈمی، ۱۹۵۲ء -

۸۔ حسرت، چراغ حسن، زرنیخ کے خطوط، لاہور، اردو اکیڈمی، ۱۹۵۱ء -

۹۔ حسرت، چراغ حسن، مردم دیدہ، لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۹ء -

۱۰۔ ذوالفقار علی بخاری، سید، سرگزشت، کراچی، معارف لمیٹڈ، ۱۹۶۶ء -

۱۱۔ راشد، ن۔م، ماورا، ۱۹۴۱ء -

۱۲۔ ساحل احمد، غزل پس منظر، پیش منظر، الہ آباد، اردو رائٹرز گلڈ، ۱۹۷۶ء -

۱۳۔ سالک، عبدالمجید، یارانِ کہن، لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۶۷ء -

۱۴۔ سندباد جہازی، مطائبات، لاہور، اردو اکیڈمی پنجاب، ۱۹۳۹ء -

۱۵۔ شورش کاشمیری، چہرے، لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۶۵ء -

۱۶۔ شورش کاشمیری، نورتن، لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۵۵ء -

۱۷۔ ضمیر جعفری، سید، کتابی چہرے، راولپنڈی، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء -

۱۸۔ ضمیر جعفری، سید، زیرِ حرف و حکایت، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۵۶ء -

۱۹۔ ظہیر الحسن جاوید، مرتبہ، مضامینِ حسرت، لاہور، شیرازہ پبلشرز، ۱۹۵۶ء -

۲۰۔ عاشق حسین بٹالوی، چند یادیں، چند تاثرات، لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۶۹ء -

۲۱. عابد، عابد علی، سید، اسلوب، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء

۲۲. عابد نظامی، میٹھے بول، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۶۷ء

۲۳. فیض، فیض احمد، شارعِ لوح وقلم، کراچی، مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۷ء -

۲۴. گوپال متل، لاہور کا جو ذکر کیا، لاہور، مکتبۂ اردو، س.ن -

۲۵. محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، اردو میں بچوں کا ادب، کراچی، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء -

۲۶. ممتاز مفتی، اوکھے لوگ، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۶ء -

۲۷. معین الرحمٰن، ڈاکٹر، جدید اردو غزل، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء -

۲۸. نصر اللہ خاں، کیا قافلہ جاتا ہے، کراچی، مکتبۂ تہذیب وفن، ۱۹۸۴ء -

۲۹. وحید قریشی، ڈاکٹر، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، لاہور، ۱۹۶۵ء

۳۰. وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور، اکادمی پنجاب ٹرسٹ، ۱۹۵۸ء -

اخبارات

۱۔ آفاق، لاہور، ۴ جولائی ۱۹۵۵ء ۔

۲۔ احسان، لاہور، ۱۸ مئی ۱۹۳۶ء ۔

۲۵ مئی ۱۹۳۶ء ۔

۳ جون ۱۹۳۷ء ۔

۳۔ امروز، لاہور، ۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء ۔

۲۶ جون ۱۹۴۹ء ۔

۲۹ نومبر ۱۹۴۹ء ۔

۱۲ اگست ۱۹۵۰ء ۔

۸ ستمبر ۱۹۵۰ء ۔

۹ جولائی ۱۹۵۵ء ۔

۲۶ جون ۱۹۵۶ء ۔

۴۔ تعمیر، راولپنڈی، ۹ جولائی ۱۹۵۵ء ۔

۵۔ نوائے وقت، لاہور، ۲۸ جون ۱۹۵۵ء ۔

رسائل

۱۔ آفتاب، کلکتہ، جنوری، ۱۹۲۶ء - فروری ۱۹۲۶ء -
اپریل، مئی ۱۹۲۶ء - جون ۱۹۲۶ء -
اگست ۱۹۲۶ء - مئی ۱۹۲۷ء -

۲۔ اختر، لاہور، ستمبر ۱۹۳۴ء

۳۔ ادبِ لطیف، لاہور، جولائی ۱۹۵۶ء

۴۔ ادبی دنیا، لاہور، اگست ۱۹۳۷ء

۵۔ اردو پنچ، راولپنڈی، شمارہ ۲

۶۔ پھول، لاہور، ۱۱، اکتوبر ۱۹۳۰ء - ۱۰، اکتوبر ۱۹۳۱ء -
۱۵، اکتوبر ۱۹۳۲ء - ۱۴، اکتوبر ۱۹۳۳ء -
۱۳، اکتوبر ۱۹۳۴ء - ۱۷، اکتوبر ۱۹۳۶ء .

۷۔ تہذیبِ نسواں، لاہور، ۵، جولائی ۱۹۳۰ء - ۴، جولائی ۱۹۳۱ء -
۳، ستمبر ۱۹۳۲ء - ۱، جولائی ۱۹۳۳ء -

۸۔ چٹان، لاہور، ۴، جولائی ۱۹۵۵ء - ۱۴، جولائی ۱۹۵۸ء -
۱۶، جولائی ۱۹۶۲ء - ۴، جولائی ۱۹۶۷ء -
۶، ستمبر ۱۹۷۱ء .

۹۔ ساقی، کراچی، جوبلی نمبر، ۱۹۵۵ء

۱۰۔ سویرا، لاہور، نیا ادارہ، نومبر ۱۹۴۹ء

۱۱۔ شیرازہ، لاہور، ۱، دسمبر ۱۹۳۶ء - ۱۶، دسمبر ۱۹۳۶ء -
۲۴، دسمبر ۱۹۳۶ء -
۸، جنوری ۱۹۳۷ء - ۸، فروری ۱۹۳۷ء -

۲۴ر فروری ۱۹۳۷ء ۔ ۸ر جون ۱۹۳۷ء ۔

۱ر جولائی ۱۹۳۷ء ۔ ۲۴ر اگست ۱۹۳۷ء ۔

۱ر ستمبر ۱۹۳۷ء ۔

۱۵ر مارچ ۱۹۴۰ء ۔ ۸ر جولائی ۱۹۴۰ء ۔

۱۲۔ صادق ، میرپور آزاد کشمیر ، جولائی ۱۹۷۷ء ۔

۱۳۔ صحیفہ ، لاہور ، ۴ شمارہ ، مارچ ۱۹۵۸ء ۔

۱۴۔ علامت ، لاہور ، ۲-۴ شمارہ ، نومبر ۱۹۸۹ء ۔ فروری ۱۹۹۰ء ۔

۱۵ فنون ، لاہور ، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۸ء ۔

۱۶۔ نقوش ، لاہور ، مکاتیب نمبر ، ۱۹۵۷ء

۱۷۔ نیا دور ، کراچی ، شمارہ ۷۹ ۔ ۸۰ ۔

۱۸ نئی صدی ، دہلی ، ۱۹۴۰ء ۔ ۱۹۴۶ء

۱۹۔ نیرنگِ خیال ، لاہور ، ۱۹۳۵ء ۔ ۱۹۵۹ء (سالنامہ)

ضمیمہ جات

حسرت کی تصانیف

۱۔ بغاوتِ عرب اور کرنل لارنس ، لاہور ، اردو کتب خانہ ، ۱۹۳۱ء ۔

۲۔ سرگزشتِ اسلام ، (چار حصے) لاہور ، ادارہ روزنامہ احسان ، ۱۹۳۷ء ۔

۳۔ اقبال نامہ ، لاہور ، سیونیار بک ڈپو ، ۱۹۴۰ء ۔

۴۔ حیاتِ اقبال ، لاہور ، تاج کمپنی ، س.ن ۔

۵۔ مردمِ دیدہ ، لاہور ، دارالاشاعت پنجاب ، ۱۹۳۹ء ۔

۶۔ مطائبات ، لاہور ، اردو اکیڈمی پنجاب ، ۱۹۳۹ء ۔

۷۔ دو ڈاکٹر ، لاہور ، اردو اکیڈمی پنجاب ، ۱۹۴۰ء ۔

۸۔ جدید جغرافیہ پنجاب ، لاہور ، اردو اکیڈمی پنجاب ، ۱۹۴۰ء ۔

۹۔ کشمیر ، لاہور ، قومی کتب خانہ ، ۱۹۴۸ء ۔

۱۰۔ کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین ، لاہور ، اردو اکیڈمی پنجاب ، ۱۹۴۹ء ۔

۱۱۔ زرنیخ کے خطوط ، لاہور ، اردو اکیڈمی پنجاب ، ۱۹۵۱ء ۔

۱۲۔ پربت کی بیٹی ، لاہور ، اردو اکیڈمی پنجاب ، ۱۹۵۲ء ۔

۱۳۔ مضامینِ حسرت (مرتبہ ظہیر الحسن) ، لاہور ، شیرازہ پبلشرز ، ۱۹۵۶ء ۔

۱۴۔ حرف و حکایت ، (مرتبہ سید ضمیر جعفری) لاہور ، مکتبۂ کارواں ، ۱۹۵۶ء ۔

۱۵۔ قائد اعظم ، لاہور ، مکتبۂ کارواں ، س.ن ۔

(رسائل)

نمبر ۱ مشرقی ہندوستان کا اکیلا ماہوار مصوّر اردو رسالہ جلد ۱

EDITOR:
Chiragh Hasan Hasrat.

مدیر
چراغ حسن حسرت

RATES.

	Rs.	As.
Annual Subscription	2	12
Half Yearly	1	8
Single copy	0	4
Foreign countries	4	0

(POSTAGE EXTRA.)

چندہ سالانہ عگ ۱۲؍
ششماہی عہ؍ بیرونجات کیلئے
فی پرچہ ۴؍ للعہ؍
(علاوہ محصول ڈاک)

دی پنجاب فائن آرٹ پریس نمبر ۱ گنگا دھر بالکین میں چھپکر دفتر آفتاب سے شائع ہوا

ادارہ

سندباد جہازی

محمود الفضل بی اے

شیرازہ

لاہور

چندہ

سالانہ تین روپے

ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے

مقام اشاعت برکت علی سٹریٹ دل محمد روڈ لاہور

ایک ادبی اور فکاہی ہفت روزہ

سال اول | یکم دسمبر ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

"شیرازہ" کے مضمون اور مضمون نگار

مولینا عبد المجید سالک — حوادث و افکار

سید امتیاز علی تاج — مُورتیوں والا شمعدان

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم — ...

غلام عباس — چند پند سود مند

بیگم صفدر علی خان — کچھ مایا کے متعلق

جناب دوزخی — غزل

ہوشیار پوری — مچھر

حاجی لق لق

سندباد جہازی، شیخ محمد ... وغیرہ

اشارات

ایک صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "شیرازہ" اپنے نام سے دفتریوں کا اخبار معلوم ہوتا ہے۔ وہ بڑے صاحب کا ارشاد ہے۔ کہ اس صورت میں اس اخبار کا نام "شیرازہ" کے بجائے "شکنجہ" ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ دفتریوں کو "شیرازہ" سے زیادہ شکنجہ سے تعلق ہے۔

بجا ارشاد ہوا۔ لیکن یہ کیوں نہ کہہ دیا۔ کہ "اصلاح" جو کابل سے نکلتا ہے۔ نائیوں کا اخبار ہے۔ کیا اچھا ہوتا۔ کہ اس کا نام "اصلاح" کی جگہ "حجامت" رکھ دیا جاتا کیونکہ حجامت زیادہ عام فہم لفظ ہے۔

سالک صاحب کے تذکرہ میں ایک اور بات یاد آگئی۔ انقلاب میں وہ "افکار و حوادث" لکھتے ہیں اور شیرازہ میں حوادث و افکار ... کرنا ... انقلاب ہی کا کام ہے۔

اطلاع

جن صاحبوں کے پاس "شیرازہ" کا پہلا پرچہ نمونہ کے طور پر پہنچا ہے۔ وہ از راہ کرم اطلاع دیں۔ کہ آیا ان کو اس کی خریداری منظور ہے یا نہیں؟ "شیرازہ" کا دوسرا پرچہ ۱۶ دسمبر کو شائع ہوگا۔ کیونکہ ایک نمبر حاصل کرنے کے لیے ہمیں کم از کم ایک ہفتہ کی مہلت درکار ہے۔

منیجر

Tis the last Rose of Summer

Tis the last rose of summer
Left blooming alone;
All her lovely companions
Are faded and gone;

No flower of her kindred,
No rossbud is nigh,
To reflect hack her blushes,
To give sigh for sigh

I'll not leave thee, thou lone one,
To pine on the stem;
Since the lovely are sleeping,
Go sleep with them.

Thus kindly I scatter
Thy leaves o'er the bed,
Where thy mates of the garden,
Lie scentless and dead.

So soon may I follow
Where friendships decay
And from Love's shining circle
The gems drop away!

When true hearts lie withered
And fond ones are flown,
Oh! who would inhabit
This bleak world alone.

T. MOORE

'JAWAN'

IS TWO YEARS OLD TODAY

JAWAN KI DUSRI SALGIRAH

SINGAPORE, 11 Sept.—The Indian Army Newspaper, "JAWAN" is 2 years old today. The editorial staff is holding a small function at 7-30 p.m. today to celebrate the occasion. You are requested to attend.

Our Staff reporter learns that this "small function" which will be in the form of a buffet dinner will be held at 291, Serangoon Road.

STOP PRESS

It was authoritatively stated later, that "you" in Column one para one means

....

No refusals will be accepted. Later developments will be communicated over the 'phone.

۱۱ ستمبر ۱۹۴۴

ملایا کے پہلے اُردو روزنامے "جوان" کی دوسری سالگرہ کا دعوت نامہ ادارۂ تحریر میں مسعود احمد، سیّد ضمیر جعفری، ابنِ سعید، انعام قافی جاوید خٹک اور ایڈیٹر چراغ حسن حسرت تھے —

غزل

اے عشق جنوں پیشہ اتنا تو کیا ہوتا
وہ ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

ناکامِ تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
~~[illegible]~~
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا دل نہ دیا ہوتا یا غم نہ دیا ہوتا

چراغ حسن حسرت کی یہ غزل اُن کی تحریر کے نمونے کے طور پر
پیش کی جا رہی ہے۔

Dear Zamir, [illegible]
15.2.47

Dear Zamir,

We have left Malaya for Bombay. The ship
has taken a northerly course and is heading
towards Bombay. We are told that we will be
there tomorrow morning.

You must be wondering what made me write to
you in English. [illegible] it is not very difficult to guess
the reason of this unusual departure on my part — English
is the only language in which I can convey my thoughts
to her. Whenever I think of her — and there have
been few moments when I have not thought of
her — English phrases, broken sentences come to my
lips without any effort. Even in my sleep
I mumble in English with a sprinkling of Malay words
and make my [illegible] wonder what it is about. But
the moments which have seen me sleeping, or to be
more accurate dozing, have been few and far between.
Whenever I try to snatch one or two hours' sleep
and after some effort succeed in dozing, her
sweet voice comes floating over the silent waves and wakes
me up. Her memory still clings to me and so far
I have not been able to shake it off. The farther I move
from Singapore the tighter becomes its grip.

چراغ حسن حسرت کے واحد دستیاب انگریزی خط کا عکس

You have been the solitary spectator of the calamity and [illegible] the whole drama or at least the greater part of it was enacted before your eyes. You know how I overrated my capability to resist her charms, thinking all the time that though she was a modern Circe I, like Oddysseus, the Greek hero could turn her magic against her. You know how miserably I failed. You were led into believing that it was only a passing fancy, and I half-suspecting the truth, tried to deceive myself that I could get away with it. My friend, it was not a passing fancy: it was something more than an infatuation.

Love is something edifying but my love for her degraded me. I stooped so low that I shall always think of some of my doings with a sense of horror. Desire is a malady or madness; in my case it was both. Yet I am confident that if an opportunity was offered to me I would do again what I did to seek her favours and would be happy about it. The deep sense of remorse I feel is

perhaps by due to the fact that I was forced to leave her. The pleasure which was always followed by pain was a short-lived one. The pain is still there, but the pleasure of her company is no longer mine, and I can not expect it in the near future.

The flame that love has lit is consuming my soul. I can not extinguish it. I am incapable of doing so. Zamir, you do not know how madly I have loved her. Only once I let you peep into my soul for a fraction of a second. I don't know what is going to happen to me.

What makes me more miserable is that during my last days in Singapore my colleagues acted in a strange manner. Sympathy sometimes hurts more than indifference or even cruelty. A bleeding heart touched by other than loving hands bleeds profusely. I know why all this happened. As Oscar Wilde has said 'we are punished for what is good and

humane in us as well as for what is evil and deg[illegible]
If it had not been for [illegible] you and Shamim I
would have died a thousand deaths before leaving Sim[illegible]
Shamim's tenderness and love has always been a
soothing balm to my bleeding souls. I have placed
both of you on a high pedestal. Let not this
edifice crumble down like the others. I have worshipped
[illegible] many clay-footed gods.

I do not ask you to keep away from her. But
do not [illegible] introduce to her to others, thus
parading my misery before all those who know me.
If this happens I will lose all faith in humanity.
Do not think that I will [illegible] remain
ignorant of all these things. Someday I will
come to know and it will hurt me so deeply.
Write to me as soon as possible. Speak to me
of her as it will make me happy to know that
she is happy.

I am afraid that I will not be able to
stop at Delhi as Major Deshpandey has arranged
to get me a new field cheque book
as soon as we land. From Bombay I shall

proceed to Lahore and have a talk with Aziz Ilahi. I shall ask him to take you as Chief Editor of Ehsan. Hold yourself in readiness to leave for Lahore as soon as you ~~get~~ receive my cable. It may reach you before this letter. I shall come to Lahore to see you and help you in conducting the paper for some days. I do not want anything for myself: I have no ambition left ~~of~~ in me.

Luthra, Deshpandey and others have been very kind to me during the voyage. Even Pathak who is a much-hated fellow has been running errands for me. In fact I do not miss Inayat, ~~[illegible]~~ because all these gentlemen behave as if they were my batmen. Even people whom I met for the first time on board the ship have shown great ~~[illegible]~~ consideration toward me. Yesterday a Sikh Captain whose name I do not know

Sent me a bottle of whisky and his kindness brought tears to my eyes. I do not know how to thank the people who try to help me because I am senior to them in years, or perhaps it is the sadness in which I am always enveloped which has moved them to pity.

My sorrow is great and I think that I shall never forget it. Anyhow I feel that the story has not ended; it may have an epilogue.

Love to Shamim

Write to me at the following address.

Yours

Isrrat

ISRAT
CARE
Sadiq Newspaper
POONCH KASHMIR

چراغ حسن حسرت کا طویل اُردو خط جو انہوں نے کرنل مسعود کے نام لکھا

غیر مطبوعہ، محررہ فروری ۱۹۴۷ء

مسعود کی شادی پر

۱- خبر لے کے آئی ہے بادِ بہار — کہ مسعود صاحب بیاہے گئے

۲- وُہ کوئے محبّت میں پہلے پہل — یہ سچ ہے فقط گا ہے گاہے گئے

۴- مگر آخرِ کار پکڑے گئے — لگے چاہنے اور چاہے گئے

۵- اَدائیں دِلوں کو پسند آگئیں — سب اطوار اُن کے سَراہے گئے

۳- نگاہیں اُگاہی بھی کرتی رہیں — دنوں میں کئی دِل اُگاہے گئے

۶- جو بھوسہ تھا باقی الگ ہوگیا — رہِ عشق میں ایسے گاہے گئے

۷- بڑی دُھوم اور باجے گاجے کیساتھ — نکاحے گئے اور بیاہے گئے

۸- محبّت کے رشتے نے جکڑا اُنہیں — گواہی کو ہم سے جُلاہے گئے

حسرت

قطعۂ تاریخ

ہنگامِ سحر شاعرِ شیریں گفتار — حیرت میں تھا سُن کے شورِ دمامہ و کوُس

اِتنے میں یہ غیب سے صدا آئی کہ "آج — مسعود ہے نوشہ بنتِ داؤد عروُس"

۱۳۶۵ھ

زندگی گزرے گی اب تو چین سے — بندھ گئی مسعود کی دُم زین سے

حسرت